خواجہ حسن نظامی

حیات اور کارنامے

سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ

خواجہ حسن ثانی نظامی

مکتبہ خلیل ○ راجپوت مارکیٹ اردو بازار ○ لاہور

خواجہ حسن نظامی

حیات اور کارنامے

خواجہ حسن نظامی

حیات اور کارنامے

سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ

مرتبہ خواجہ حسن ثانی نظامی

مکتبہ خلیل ۔ راجپوت مارکیٹ
اردو بازار ۔ لاہور

ناشر:۔ اکمل امین پرنٹر گنج شکر پریس لاہور

فہرست

حرفِ آغاز

دہلی ہندوستان کا دل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شہر اپنی تہذیبی روح، ثقافتی رنگارنگی اور تاریخی کردار کے اعتبار سے ایک چھوٹا سا ہندوستان ہے۔ دہلی کلچر کے فروغ میں اردو نے ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے اور آج بھی یہ زبان اس کی ادبی و تہذیبی شناخت کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ اردو کی کلچرل اہمیت اور دہلی کی ثقافتی زندگی سے اس کے گہرے رشتے کے پیشِ نظر آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی، سابق وزیر اعظم مرکزی حکومتِ ہند کے ایما پر ۱۹۸۱ء میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔

اکادمی کا اپنا ایک انتظامی ڈھانچہ اور طے شدہ دستور العمل ہے۔ دہلی کے لفٹننٹ گورنر اس کے صدر نشین (چیرمین) ہیں اور اکادمی کے اراکین کو دو سال کے لیے نامزد کرتے ہیں۔ ان اراکین میں ممتاز اہلِ قلم، ادیب، نقاد، صحافی معلم اور محقق شامل ہیں۔ اکادمی دہلی اور بیرونِ دہلی دوسرے علمی، ادبی، تہذیبی اور تعلیمی حلقوں سے بھی رابطہ قائم کیے ہوئے ہے اور اپنی سرگرمیوں میں اُن کے تعاون اور مشوروں کو خوش آمدید کہتی ہے

ہمیں احساس ہے کہ کتاب انسان کی بہترین ساتھی ہے اور کتاب کا مطالعہ اس کا شریف ترین مشغلہ، کتاب ماضی کو حال اور حال کو مستقبل سے جوڑنے کا سب سے عمدہ وسیلہ ہے۔ اپنے اس بیش بہا ورثہ کو محفوظ کرنا اسے خوب تر اور مفید تر بنانا ہمارے تہذیبی

فرائض کا سب سے اہم حصّہ ہے۔ یہ گویا ادبی روشنیوں کو عام کرنا اور علمی خوشبوئں کو پھیلانا ہے۔

اکادمی نے نہایت اہم موضوعات پر اچھی کتابوں کی اشاعت کا جو منصوبہ بنایا ہے اُسی کے تحت مذاکرے، سیمینار، ورکشاپ منعقد کیے اور ان میں پیش کیے جانے والے مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ یہ "مصورِ فطرت، شمس العلمار خواجہ حسن نظامیؒ دہلوی شخصیت اور کارنامے" اسی سلسلہ پیش کش کا ایک حصّہ ہے۔ یہ یک روزہ سیمینار ۱۸ مارچ ۱۹۸۴ء کو ایوان غالب میں منعقد ہوا۔ اس کے لیے ہم اس کے فاضل مرتب کی علمی کاوشوں کے ممنون ہیں۔ اور اس تعاون کے بھی جو اشاعتی کمیٹی کے ارکان کی طرف سے ہمیں میسّر آتا ہے اور ہمارے لیے روشنی و رہنمائی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے علاوہ دہلی کی تاریخ وادبیات کے متعلق کچھ ایسی اہم کتابیں بھی شائع کی ہیں جو کمیاب بلکہ نایاب ہو چکی تھیں ایسی مزید کچھ کتابیں ترتیب واشاعت کے مراحل سے گزر رہی ہیں۔

ہم اپنے موجودہ سرپرست اور اکادمی کے صدر نشین ایر وائس مارشل (ریٹائرڈ) جناب ایچ۔ ایل۔ کپور صاحب کی عنایات اور توجہات کے بے حد ممنون ہیں۔ ایگزیکیٹو کونسلر (تعلیم) جناب کلانند بھارتیہ کی عنایت کا بھی اعتراف ہے اور ان کی رہنمائی کے لیے بھی شکر گذار ہیں

سید شریف الحسن نقوی

سکریٹری

اردو اکادمی۔ دہلی

۶ فروری ۱۹۸۷ء

پیش لفظ

دہلی میں نثر نگاری کی پہلی سنجیدہ کوشش فضل علی فضلی کی "کربل کتھا" میں نظر آئی ہے "کربل کتھا"، واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف "روضۃ الشہدا" کا اردو میں آزاد ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ مذہبی ضرورت سے عام لوگوں کے لیے کیا گیا تھا۔ اس لیے فضلی نے بہت عام فہم آسان زبان استعمال کی ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ پہلی بار دہلوی نثر کے مزاج کی تشکیل ہوئی یہ نثر روزمرہ اور بول چال کی زبان سے قریب ہے اور اس میں فارسی و عربی کے موٹے موٹے الفاظ اور ترکیبیں کم سے کم استعمال کی گئی ہیں۔ ہاں فارسی سے ترجمہ ہونے کی وجہ سے اس نثر کی قواعدی ساخت عام طور سے فارسی انداز پر ہے "کربل کتھا" کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کی طرح اردو نثر بھی خود کو فارسی سے آزاد کرانا چاہتی ہے۔ لیکن ابھی اس کوشش میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوئی۔

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اس کا مقصد ان انگریزوں کو دوسرے علوم کے ساتھ دیسی زبانیں سکھانا تھا جو بنگال، مدراس اور بمبئی میں جونیر سول ملازمین کی حیثیت سے کام کرتے تھے اس کالج کے سامنے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ اردو میں اب تک جتنی بڑی تصنیفات شائع ہوئی تھیں اُن میں سے ایک کتاب بھی اس میں نہیں تھی کہ جسے نصاب میں شامل کیا جاسکتا ہو۔ مجبوراً کالج نے خود نصابی کتابیں تیار کرنے کا کام شروع کیا اس مقصد کے لئے اردو اور دوسری زبانوں کے ادیبوں کو اوّل میر منشی سیکنڈ منشی اور ماتحت منشی کی حیثیت سے رکھا گیا۔ مستقل ملازم کی حیثیت سے تقریباً چوبیس ادیبوں کا تقرر ہوا دلچسپ بات یہ کہ ان میں تقریباً پندرہ ادیبوں کا تعلق دہلی

سے تھا۔ ان ادیبوں کی پرورش دہلی میں ہوئی تھی یا دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور بچپن میں والدین کے ساتھ کسی اور شہر چلے گئے تھے۔

فورٹ ولیم کالج نے بہت بڑی تعداد میں کتابیں تیار کیں لیکن جو شہرت اور مقبولیت میر امن دلی والے کی "باغ و بہار" کو ملی وہ کسی اور کتاب کو نصیب نہ ہوئی اس مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ بقول میر امن "اس قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان عورت مرد لڑکے بالے خاص و عام بولتے چالتے ہیں کیا ہے۔۔۔ اس محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے" میر امن کی باغ و بہار دہلوی نثر کا دوسرا سنگ میل ہے اس کتاب میں پہلی بار اُردو نثر فارسی کے اثر سے مکمل طور پر آزاد نظر آتی ہے۔ تیسرا سنگ میل غالب کے خطوط ہیں ان کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہے کہ غالب نے خطوط کو گفتگو کا بدل سمجھ لیا تھا اور بقول غالب "میں نے آسان راستہ اختیار کر لیا ہے جو بھی لکھتا ہوں اُردو میں لکھتا ہوں نہ سخن آرائی نہ خود نمائی تحریر کو گفتگو بنا لیا ہے" گویا تحریر کا تقریر سے قریب تر ہونا دہلوی نثر کی سب سے اہم خصوصیت قرار پائی۔

خواجہ حسن نظامی کی زبان اور موضوعات عوام اور خواص دونوں کے لئے ہیں وہ اس راز سے واقف ہیں کہ اپنا مخاطب عوام کو بناؤ تمہاری بات خواص کی سمجھ میں خود بہ خود آجائے گی۔ خواجہ صاحب کی نثر گفتگو روزمرہ اور عام بول چال سے بہت قریب ہے۔ پھر میر امن اور غالب کی طرح ان کا مخصوص اسلوب بھی ہے اس لئے خواجہ صاحب کی نثر دہلوی نثر میں چوتھا سنگِ میل ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ اس صاحبِ طرز نثر نگار پر اُردو اکادمی نے سیمینار کیا اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں پر مقالے پڑھوائے ہم شکر گزار ہیں خواجہ حسن ثانی نظامی کے جنھوں نے سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالے کتابی صورت میں مرتب کئے اور خواجہ صاحب پر لکھے جانے والے کچھ اور مضامین بھی شامل کیے یہ کتاب خواجہ صاحب کی شخصیت اور فن پر مقالوں کا بہت اچھا مجموعہ بن گئی ہے۔

خلیق انجم

اِبتدائیہ

اُردو اکادمی دہلی نے مشاہیر دہلی پر سمیناروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس کی ابتدا شمس العلماء مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ سے ہوئی ہے۔ اور بالکل درست ہوئی ہے کہ خواجہ صاحب اُردو کی آبرو بھی تھے۔ اور دہلی کی آبرو بھی تھے۔ ادبی دنیا میں دبستان دہلی کی جس سادگی اور پرکاری کی دھوم ہے۔ خواجہ صاحب اس کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔

زیرِنظر مضامین اُردو اکادمی کے اس سمینار میں پڑھے گئے تھے جو حضرت خواجہ صاحب کی حیات اور کمالات کا جائزہ لینے کے لئے ایوانِ غالب میں منعقد کیا گیا تھا۔ اور اب جناب سید شریف الحسن نقوی، مُشیر اُردو اکادمی کے حسن اہتمام سے یہ مضامین زیورِ طبع سے آراستہ ہوا چاہتے ہیں۔

خواجہ صاحب ان باکمال اور بے مثال دہلی والوں میں سے تھے۔ جن کی زندگی اور جن کے کام کا مکمل جائزہ لینا کسی ایک سمینار کے بس کی بات نہیں ہے۔ حضرت خواجہ صاحب کی وفات کو تقریباً تیس برس گذر چکے ہیں۔ ان کی وفات ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء کو ہوئی تھی۔ (پیدائش ۲ محرم ۱۲۹۶ھ) اسی عرصے میں خواجہ صاحب کے ایسے احباب اکثر و بیشتر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں جو ذاتی تعلق اور واقفیت کی بنا پر ان کے بارے میں نئی باتیں بتا سکتے تھے۔ اور نیا مواد فراہم کر سکتے تھے۔ خواجہ صاحب کی کتابوں اور تحریروں کی مکمل فہرست بھی ابھی تک نہیں بن سکی ہے۔ ان کی تصانیف کا شمار سینکڑوں میں کیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں

سے بہت سی ناپید کے حکم میں آنا چاہتی ہیں۔ خواجہ صاحب اپنی کتابوں کی چھپائی اور فروخت کا کام عموماً خود ہی کرتے تھے اور ان کی مصروفیات اس قدر گوناگوں تھیں کہ بعض ایسی کتابیں بھی نئے ایڈیشنوں سے محروم رہیں جن کو چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ ان کے متفرق مضامین بھی جو تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کے اخبار، رسالوں کی زینت بنتے رہے۔ ابھی تک جمع نہیں کئے جا سکے ہیں۔ نیز ان کے مشہور اور مقبول روزنامچے بھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے ہیں اور ان کے لکھے ہوئے اشتہار بھی جن کو خواجہ صاحب کی وجہ سے اُردو میں پہلی دفعہ ایک فن کی حیثیت ملی منتشر ہیں اور معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔

ان حالات میں خواجہ صاحب پر سمینار کا انعقاد اور صاحب نظر مشاہیر سے ان پر مضامین لکھوانا اُردو اکادمی دہلی کی ایک اہم خدمت ہے۔ مضامین لکھنے والوں میں کچھ قلم کار ایسے ہیں جنھوں نے خواجہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور کچھ ایسے جنہوں نے خواجہ صاحب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

اُردو کے مشہور ناقد اور محقق ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اور جناب سوہن لال بھٹناگر کے مقالے ذاتی تاثرات پر مشتمل ہیں اور پروفیسر محمد حسن اور ڈاکٹر شارب ردولوی جیسے مشاہیر نے خواجہ صاحب کے نثری اسلوب اور انشائیوں کا جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر انور صدیقی بنیادی طور پر انگریزی کے آدمی ہیں۔ لیکن ان کی پہچان اُردو کے ذریعے ہے۔ انھوں نے خواجہ صاحب کے انشائیوں اور اسلوب پر قلم اُٹھاتے وقت مغربی روایات اور اصولوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ ڈاکٹر ساجدہ اسد کا نام بھی ہندی والوں میں لیا جاتا ہے۔ وہ خواجہ صاحب کے ہندی ترجمہ قرآن پر بھی ایک معرکتہ الآرا مضمون لکھ چکی ہیں۔ یہاں انھوں نے خواجہ حسن نظامی اور ہندوستانی ثقافت کو موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر کامل قریشی کا موضوع بھی ان سے ملتا جلتا ہے کہ انھوں نے قومی اتحاد کے عنوان سے اس البیلے صوفی کی زندگی اور تعلیمات کا مطالعہ کیا ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے خواجہ صاحب کی شخصیت کا عکس ان کی اپنی تحریروں کے آئینے میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔

حضرت خواجہ صاحب نے اُردو کو جو نئی چیزیں عطا کی ہیں۔ ان میں اُردو کے

دعائیہ لٹریچر کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ متفرق دعائیہ مضامین کے علاوہ ان کی ایک علیحدہ تصنیف اردو دعاؤں کے نام سے بھی ہے۔ اور اس میں خالق سے مخلوق کا ربط مخلوق کی مادری زبان میں قائم کرایا گیا ہے۔ جناب اختر الواسع نے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز سے تعلق رکھتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی اُردو دعاؤں پر مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے خواجہ صاحب کی تصنیفات میں سے کسی ایک تصنیف کے بھرپور مطالعے کے لئے تاریخ فرعون کا انتخاب کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ انھوں نے اس مطالعے کا حق ادا کردیا ہے۔

میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ کوئی ایک سیمینار یا محض چند مضامین میں حضرت خواجہ حسن نظامی کی رنگا رنگ اور صد پہلو شخصیت کے مطالعے کے لئے کافی نہیں ہیں لیکن اُردو اکادمی نے اس مطالعے کی ابتدا کردی ہے۔ آنے والے زمانے میں خُدا نے چاہا تو اس کی تکمیل بھی ہوجائے گی۔ یہ مجموعہ مضامین ایک اچھی ابتدا ہے اور اُردو اکادمی، دہلی کے اراکین اور کارکن اُردو دُنیا کی طرف سے مبارکباد اور شکریے کے مستحق ہیں۔

۲۱ فروری ۱۹۸۶ء

سید مظفر حسین برنی

(سید مُظفر حُسین برنی)

گورنر ہریانہ

تعارف

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی بڑی جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔ عالم، صوفی، معلم، مصلح، ادیب، مقرر، تاجر نہ جانے کس کس حیثیت سے انھیں جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ اتنی صفات کسی ایک ذات میں کم ہی جمع ہوا کرتی ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب کے ہاں نہ صرف یہ صفات جمع تھیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کو شرف و وقار بھی ملا تھا۔

خواجہ صاحب کے پاس کتابی علم بھی تھا۔ اور وہ علم بھی جو کتاب کا محتاج بنے بغیر حاصل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے بے شمار بزرگوں کی آنکھیں دیکھیں صحبت اُٹھائی۔ مسلمان علماء اور ہندو وِدوانوں، سب کا فیض انھیں ملا۔ خواجہ صاحب کو دیکھنے والی آنکھ اور نتائج اخذ کرنے والا دماغ ملا تھا۔ ان کے ساتھی ملّا واحدی دہلوی نے لکھا ہے کہ مَیں خواجہ صاحب کے ساتھ روز سیر کرنے جایا کرتا تھا۔ واپس آنے کے بعد سیر کے مشاہدات کی مدد سے خواجہ صاحب کئی مضمون تیار کرلیا کرتے تھے اور مَیں سوچتا رہ جاتا تھا کہ یہ چیزیں خواجہ صاحب کے ساتھ دیکھی تو مَیں نے بھی تھیں مگر واپس آکر مجھے ان کا دھیان کیوں نہیں رہا؟ اور مَیں نے ان چیزوں میں وہ معنویت کیوں نہ پائی جو خواجہ صاحب کے حصّے میں آگئی ہے۔ قدرت کی اس غیر معمولی دین کا احساس خواجہ صاحب کو اچھی طرح تھا۔ اور وہ اس سے پورا فائدہ اُٹھاتے تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ اپنے بڑے لڑکے خواجہ حسین نظامی سے جو انگریزی زبان و ادب پر عبور رکھتے تھے کہا تھا کہ بیٹا تم نے انگریزی پڑھی ہے۔ اور تمہارے باپ نے انگریز کو پڑھا ہے۔

خواجہ صاحب نے انگریز کو ہی نہیں پڑھا۔ کائنات کی چھوٹی بڑی سب اشیا کو

پڑھا۔ گھاس کے تنکے، دیا سلائی، مکھی مچھر الّو سے لے کر اعلیٰ موضوعات تک کو انھوں نے اپنے مطالعے کے لئے چُنا اور اپنے اس مطالعے کے نتائج کی اطلاع سب کو دی۔ خواجہ صاحب اُردو کے صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ زیرِ نظر کتاب میں جو مضامین شائع کئے جا رہے ہیں۔ ان میں خواجہ صاحب کے ادبی کمالات کا خاصی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ لیکن اس جائزے کے بعد بھی ان کے بارے میں ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔ خواجہ صاحب نے ایک ہزار کے قریب قلمی چہرے لکھے تھے۔ افسوس کہ انھیں ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں کیا جا سکا ہے۔ یہ قلمی چہرے انسانوں کے بھی ہیں اور حیوانات، نباتات، جمادات اور مظاہر قدرت کے بھی ہیں۔ ان لفظی تصویروں کا کینوس کتنا بڑا ہے اور خواجہ صاحب کے مطالعے اور مشاہدے کی وسعت کا کیا عالم ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس مصوّر فطرت نے خُدا کا قلمی چہرہ بھی لکھا ہے، شیطان کا بھی اور خیر و شر کے منظر دکھانے کے لئے پیر پیغمبروں مشائخ علماء اوتاروں کے ساتھ فلم ایکٹرسوں کی تصویریں بھی کھینچی ہیں اور ایسی کھینچی ہیں کہ حق ادا کر دیا ہے۔

یہ تصویر کشی اور پتّے پتّے میں معرفت کردگار کو دیکھنا اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ مصوّر الگ تھلگ رہ کر تصویریں بناتا رہتا۔ اور عارف کسی خاموش حجرے یا پُرسکون غار میں رہ کر گیان کتھا سناتا۔ مگر خواجہ حسن نظامی نہ الگ تھلگ رہنے والے مصوّر تھے نہ ایسے راہب جس کو زندگی سے واقفیت کے باوجود زندگی سے سروکار نہ ہو۔ انھوں نے زندگی کی تگ ودو میں بھرپور حصّہ لیا۔ اس کی شیرینی اور تلخی کو چکھا اس کو بنایا سنوارا اس کی ہر للکار کا جواب للکار سے دیا۔ وہ گلاب کے مقابلے میں کیکر کے پھول کی تعریف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ دھوپ کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

"کیکر کا پھول، گلاب کے پھول سے لاکھ درجہ اچھا۔ گلاب کا پھول ایک دن کی تیز دھوپ میں کمہلا اور مُرجھا جاتا ہے۔ اور کیکر کا پھول ہفتوں سُورج کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور آج کل تعریف اسی کی ہے جو دُشمن کے مقابلے میں زندہ سلامت رہے!" (سی پارۂ دل۔ گلاب تمہارا کیکر ہمارا)

خواجہ صاحب فلسفۂ ویدانت سے متاثر ہونے کے باوجود ویدانتیوں کی طرح دُنیا کو مایا جال نہیں مانتے تھے۔ شر کی فتوحات اور موت اور فنا کے چکر نے انھیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ وہ اپنی گیان کتھا یوں سُناتے ہیں۔

"اپنے گیانی دیس ہندوستان کو کیا کہوں۔ بدیسی سنگت سے اگیانی ہوگیا ہے . . . . رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں نور و ظلمت کی دو حکومتیں پلٹ جاتی ہیں۔ یہ کیوں ہے؟ تیرے صبر و قرار کے لئے سنسار بے قرار ہے۔ شعلے بھڑکتے ہیں۔ دریا بہتے ہیں۔ سمندر موجیں مارتا ہے۔ ہوا چلتی ہے۔ بادل آتے جاتے برستے برساتے ہیں۔ بجلی چمکتی کڑکتی ہے۔ بوندیاں اعلیٰ سے اسفل ہوتی ہیں تاکہ تیرا وجود انقلاب ایام سے گھبرا نہ جائے اور جانے کہ گردش ہر موجود کی ڈیوٹی ہے۔ بدلنا ہر حالت کا اقتضا ہے . . . . . . پھانس نکلنے کو چبھتی ہے۔ پیاس بجھنے کو لگتی ہے۔ بھوک پیٹ بھرنے کے لئے پیدا ہوتی ہے۔ جب کانٹا چبھے تو سمجھ لے کہ اس کو ایک وقت نکلنا ہے۔ بھوک پیاس کی خواہش ہو تو خیال کر کہ کھانا پانی ملنا لازمی ہے۔ بیماری آئے تو یقین کر کہ تندرستی بھی اس کے ساتھ ہے . . . . انسان! آدمی! خیال کر جب ہر چیز اپنی غرض اور ذاتی مطلب کے لئے متحرک ہے تو تُو کیوں پریشان ہوتا ہے۔ کرم کر عمل کر گیان موکش نجات سرور ابدی عمل و حرکت میں ہے۔"

(سی پارہ دل گیان کتھا)

اپنے اس قول پر خواجہ صاحب کا عمل بھی تھا۔ پیر ہونے کے باوجود نہ کبھی وہ گوشہ نشین ہو کر بیٹھے نہ انھوں نے کبھی مُریدوں کی نذروں پر انحصار کیا وہ کتابوں کے کاروبار سے دواؤں کے کاروبار سے روزانہ اٹھارہ، اٹھارہ گھنٹے محنت کر کے اپنی روزی حاصل کرتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے ایک دفعہ مذاق میں کہا تھا لیکن سچ کہا تھا کہ

؎ صوفی بھی ہیں، رئیس بھی ہیں اور ملنگ بھی
وہ جانتے ہیں خواجہ تجارت کے ڈھنگ بھی

خواجہ صاحب کہا کرتے تھے کہ ہر پیر کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ میری خصوصیت محنت، حلال روزی اور زندگی کی جدوجہد میں بھرپور حصّہ لینا ہے۔ میرے جس مُرید میں یہ خصوصیات پائی جائیں وہ سمجھ لے کہ میرا سچا مُرید ہے۔

خواجہ صاحب کسی کو بیکار نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کسی کی مدد بھی کرنی ہوتی تو اس سے ضرورت بے ضرورت محنت کراتے۔ اور پھر اس کے حق سے زیادہ معاوضہ ادا کرتے۔ ہٹّے کٹّے آدمی کی امداد کرنا ان کے نزدیک قوم کو اپاہج بنانا تھا خواجہ صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے مختلف پیشوں سے مُتعلق لٹریچر تیار کرا کے شائع کیا۔ تاکہ کم تعلیم یافتہ اور کم حیثیت کے لوگ بھی کسی نہ کسی دھندے میں لگ سکیں۔ ان کی لکھی ہوئی یا لکھوائی ہوئی کتابیں نوکری، حلوائی کی تعلیم، مُرغی انڈے کا بیوپار، گھریلو دھوبی گھاٹ، فن انجینئری وغیرہ ان کے اسی جذبے کی آئینہ دار ہیں۔

خواجہ صاحب کی خدمات تعلیمی میدان میں بھی بہت ہیں۔ انھوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کے علیحدہ علیحدہ اسکول جاری کئے۔ ہوسٹل بنائے اور اس کے ساتھ ہی چھوٹے بچّوں کے لئے اُردو میں لٹریچر تیار کیا۔ اس لحاظ سے بھی وہ اُردو لٹریچر کی تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے تعلیمی ضروریات کے تحت "اسکول گزٹ" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ ایک دوسرا اخبار "عورتوں کا اخبار" بھی اسی غرض سے انھوں نے نکالا کہ ہندوستانی خواتین نئی تعلیم کی طرف رجوع ہوں اور ان کو گھر کی اور باہر کی ضروریات سے آگاہ کیا جائے۔ اسی خاص باب میں ان کی لگن کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے ملحق اپنے گھر کی ایک دیوار پر جہاں بے شمار لوگوں کی نظریں پڑتی تھیں۔ جلی حروف میں لکھوا رکھا تھا۔ کہ ہندوستان کا مستقبل اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کی طرف لڑکوں سے بھی زیادہ دھیان دیا جائے کیونکہ آنے والی نسل ہماری بچیوں کی گود ہی میں پروان چڑھے گی۔ اگر ہماری بچیاں سنور گئیں تو آئندہ نسل اپنے آپ سنور جائے گی۔ خواجہ صاحب کا خیال تھا کہ تعلیمی نصاب اس طرح بنائے جائیں کہ مقصد صرف لکھنا پڑھنا سکھانا نہ رہے بلکہ خود انہی کے الفاظ

میں "بچیوں کو گھر کی اور باہر کی ہر ضرورت سے آگاہ کیا جائے اور حاکمانہ خدبۂ انتظام ان میں پیدا کیا جائے"

خواجہ صاحب نے سماج میں رائج فضول رسموں کے خلاف بھی زبردست مہم چلائی تھی۔ اور اس مہم میں ان کو خاصی کامیابی بھی ہوئی تھی۔ جلسے جلوسوں اور دوسری انفرادی اجتماعی کوششوں کے ساتھ انھوں نے مضامین اور پوسٹروں اور اشتہاروں کے ذریعے بھی رسموں کے خلاف جہاد کیا۔ ان کے یہ مضامین اور اشتہار اُردو زبان کے اصلاحی لٹریچر کا اہم حصہ ہیں۔ رسموں کی بیخ کنی کو انہوں نے صرف شادی بیاہ وغیرہ کی رسموں تک ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ خانقاہوں اور درگاہوں کی غیر مفید رسوم کو بھی ترک کرایا۔ اور تصوف کو ایک حرکی فلسفے کی حیثیت سے پیش کیا۔ جس کو روزمرہ کی زندگی میں برتا اور اپنایا جا سکتا ہے۔ اور جس کے ذریعے کامیاب اور راحت کی زندگی گذاری جا سکتی ہے۔

صوفی طرزِ زندگی کے تانے بانے توحید سے بنے جاتے ہیں۔ توحید سب کو سمیٹتی ہے۔ ایک مرکز پر لاتی ہے۔ یکسو کرتی ہے۔ دوئی اور غیریت کی دیواریں گراتی ہے۔ توحید کی اسی کیفیت نے ہماری مشترکہ اور گنگا جمنی تہذیب کو زندگی بخشی ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے اس روایت کو اپنے بزرگوں کی طرح آگے بڑھایا۔ وہ اُردو کے شائد پہلے مصنّف ہیں جنہوں نے پیغمبر اسلام ؐ کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ، سری کرشن اور گورو نانک کی سوانح عمریاں لکھیں اور ہر سوانح عمری میں عقیدت اور محبت کا خراج پیش کیا۔ وہ سری رام چندر جی کے اُپدیش کو اردو داں عوام کے سامنے لائے۔ اور قرآن مجید کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ لٹریچر کے ذریعے ملک و قوم میں اتحاد پیدا کرنے کا جو عظیم الشان کام اُنھوں نے کیا اس کی ہمیشہ قدر کی جائے گی لیکن اس سے بھی بڑا کارنامہ ان کا یہ ہے کہ وہ ہندی اور اُردو زبانوں کو قریب لے آئے۔ خواجہ صاحب کی تحریر اگر فارسی رسم الخط میں چھپے تو وہ اُردو ہے اور اگر اسے ناگری لپی میں شائع کیا جائے تو وہ ہندی ہے کہ کسی بھی ہندی والے کو خواجہ صاحب کی زبان سمجھنے میں دُشواری نہیں ہوگی۔

خواجہ صاحب نے اُردو میں سادہ اور آسان نثر کو رواج دیا۔ اور سب کو بتا دیا

کہ مشکل مضامین بھی اس عام فہم زبان میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔ بابائے اُردو مولانا عبدالحق نے لکھا تھا کہ

"آج کل اپنی جہالت چھپانے یا اپنی علمیت جتانے کے لئے خواہ مخواہ لوگ عربی فارسی ترکیبوں اور مشکل اور دقیق الفاظ کا بوجھ بے چاری اُردو کی گردن پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ اس کی متحمل نہیں ہوتی۔ یہ اُردو کی ترقی نہیں تنزل ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اردو سب میں مقبول ہو۔ مگر ان تحریروں سے وہ مردود ہوتی ہے۔ جو فصاحت سادگی میں ہے۔ وہ ان پیچیدہ اور مغلق تحریروں میں کہاں۔ یہ گُر کوئی خواجہ صاحب سے سیکھے!"

خواجہ صاحب کا یہ گُر نئے زمانے نے خوب سیکھا ہے۔ اس کو سیکھے بغیر نئے دور کے تقاضوں کو پورا بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حکومت اور اقتدار کی طرح اب زبان و ادب بھی خواص کی ملکیت نہیں رہے۔ یہ زمانہ سلطانیٔ جمہور کا زمانہ ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے آپ کو اس نئے دور کا نقیب بنایا۔ نیا دور اپنے اس نقیب کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔

اُردو اکادمی، دہلی پہلی دفعہ ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کر رہی ہے۔ جو اُردو کے مشہور ادیبوں اور نقادوں نے وقتاً فوقتاً لکھے تھے یا اکادمی کی طرف سے منعقد ہونے والے سیمینار میں پڑھے گئے تھے۔ ان مضامین کے ذریعے خواجہ حسن نظامی کے کمالات اور خدمات کا عرفان عام ہو گا۔ سیمینار کے مضامین کا اجمالی تعارف ہز ایکسی لینسی سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ اپنے پیش لفظ میں کرا چکے ہیں۔ اس لئے ان کا دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ نئے مضامین میں ذاتی حالات پر مشتمل ایک مضمون خواجہ صاحب کے چھوٹے صاحبزادے خواجہ مہدی نظامی کا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالماجد دریا بادی جناب صلاح الدین صاحب ایڈیٹر "ادبی دُنیا" لاہور۔ جناب سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی۔ ڈاکٹر خلیق انجم جناب عبداللہ قریشی۔ پروفیسر مُشیر الحق۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ —— سب ایسے مشہور اور جانے پہچانے اہلِ قلم ہیں کہ ان کے بارے میں یا ان کے لکھے ہوئے مضامین کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی چنداں

حاجت نہیں ہے۔ ان سب مضامین نے خواجہ صاحب اور ان کے کمالات کے تعارف کا حق بڑی حد تک ادا کر دیا ہے۔ البتہ ایک کمی مجھے اس مجموعے میں خاص طور پر محسوس ہوتی ہے۔ اور دراصل یہ کمی اس مجموعے کی نہیں بلکہ ہم سب کی بے خیالی کی کمی ہے کہ کوئی مضمون خواجہ حسن نظامی اور اکبر الہ آبادی کے عنوان سے نہیں لکھا گیا۔ حضرت اکبر سے خواجہ صاحب کا بڑا گہرا تعلق تھا۔ خواجہ صاحب انھیں اپنے باپ اور اُستاد کی جگہ سمجھتے تھے۔ اور حضرت اکبر سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ خواجہ صاحب کے نام مکاتیب اکبر کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ لیکن کوئی سیر حاصل مضمون جیسا کہ خواجہ صاحب اور علامہ اقبال کے عنوان سے ڈاکٹر عبداللہ نے لکھا ہے اور اس مجموعے میں شامل ہے۔ ابھی تک اکبر اور خواجہ صاحب کے تعلقات پر نہیں لکھا گیا۔ امید ہے آئندہ ایڈیشن کے وقت تک اس موضوع کا حق بھی ادا ہو چکا ہوگا۔ حق اُردو اکادمی، دہلی نے اب بھی ادا کیا ہے۔ اور یہ حق ایسا تھا جو خواجہ حسن نظامی کا حق بھی تھا۔ اُردو کا حق بھی تھا اور دہلی کا حق بھی تھا۔ اکادمی شکریے کی مستحق بھی ان تینوں کی طرف سے ہے۔

(خواجہ) حسن ثانی نظامی

حجرہ قدیم درگاہ

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا:

نئی دہلی

سمینار کے مقالات

پروفیسر محمد حسن

خواجہ حسن نظامی کی اسلوبی شخصیت

خواجہ حسن نظامی اردو نثر کے نظیر اکبر آبادی تھے۔ نظیر اکبر آبادی کی طرح روزمرہ کی سیدھی سادی معمولی معمولی چیزوں کو عزت اور وقار بخشنے والے، عوام کے بیچ میں رہنے اور ان کے دکھ سکھ کی بات کرنے والے، روزانہ کی زندگی کی سچی اور بے ریا تصویریں ننھوں میں ننھیں باتوں میں کھینچنے والے، غرض اردو کی جمہوریت میں نظیر اکبر آبادی کے بعد خواجہ صاحب ہی کی خواجگی کا سکہ چلا۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

"اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور رہیں، میں ان کو چار چاند لگا کر چمکا دوں گا۔"

(جھینگر کا جنازہ)

ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں:

"میں دمڑی کا آدمی ہوں۔ سوئیاں سستی تھیں تو اپنی گدڑی میں آسانی سے پیوند لگا لیتا تھا۔ اب یہ دونوں (یعنی سوئیاں اور رنگ) اس قدر گراں ہیں کہ میں نہ سوئیاں خرید سکتا ہوں نہ رنگ۔ یونہی میلا کچیلا چیتھڑے لگائے پھرتا ہوں۔ . . . . میں تو روکھی روٹی پیٹ بھر کر اور کنوئیں کا پانی اور ٹن کا موٹا جھوٹا کپڑا اچھا سمجھتا ہوں۔" (کم ان مائی ڈیر ۱۹۱۶ء)

ان عبارتوں میں آسمان کیسا چمکیلا اور دھوپ کیسی چٹکیلی نکھری لگتی ہے۔ زندگی کی معمولی

سے معمولی شے اپنے پرت کھولنے لگتی ہے اور ہستی کی ساری نعمتیں اسی ایک معمولی شے میں نظر آنے لگتی ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کے پاس پھر بھی بہت سے سہارے تھے۔ شاعر کے پاس قافیے کی جھنکار، ردیف کا چٹخارا، اور شعری اسلوب کے بہت سے پینترے ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے یہ کمال کیا کہ یہ سب کام نثر میں کر دکھایا کہ نہ قافیہ نہ ردیف، نہ بحر نہ وزن، نہ تشبیہ کا جادو نہ استعارے کی بیساکھی اور سیدھی سادی نثر میں یوں لکھتے چلے گئے جیسے وہ ان سب سے بے نیاز ہوں۔ یہ بے نیازی بڑی دشوار ہے۔ اسی لیے کسی نے کہا ہے۔ "دشوار ست آساں زیستن"۔ خواجہ صاحب کے اس آسان زیستن ہی میں ان کے نثری اسلوب کا راز بھی کہیں چھپا ہوا ہے۔ یہ مانا کہ اسلوب محض شخصیت نہیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے مگر شخصیت میں شاید اسلوب کی کلید تلاش کی جا سکتی ہے۔

قلم اور کاغذ ادب کے معاون بھی ہیں اور اس کے بدترین دشمن بھی کہ لفظ جب قلم سے کاغذ پر منتقل ہوتا ہے تو لفظ کا رشتہ جیتی جاگتی گفتگو سے کٹ کر تحریر سے جڑنے لگتا ہے اور زبان کتابی ہونے لگتی ہے۔ لفظ وہی زندہ ہے جو بات چیت سے ابھرے۔ بات چیت سے بے تکلفی پیدا ہوتی ہے۔ لفظ لہجہ بنتا ہے، اشارے کنایے سے نت نئے رنگ نیرنگ پاتا ہے۔ زبان کے خودرو پودے کی طرح بات چیت کا لفظ شخصیتوں کی گرمی اور نرمی سے ابھرتا ہے۔ قلم جب انھیں لفظوں کو تحریر میں لے آتا ہے تو گویا گفتگو کی ساری گرمی، لہجے کی رنگینی، بات چیت کی رنگارنگی فنا ہو جاتی ہے اور لفظوں کی نیم مردہ لاشیں کاغذ پر بکھر جاتی ہیں جن میں کہیں کہیں زندگی کی رمق ہوتی ہے، گو وہ زندگی اکثر کتابی ہوتی ہے۔ لفظ بولی نہیں رہتا، بات نہیں رہتا، تحریر بن جاتا ہے۔ بناوٹی پن پیدا کرنے والی قلم اور کاغذ کی اس دیوار کو بہت کم مصنف فتح کر پائے ہیں۔ خواجہ صاحب ان میں سے ایک ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔ "جھینگر کا جنازہ" میں لکھتے ہیں:

"میری سب کتابیں چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔

اقوہ۔ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں جو وہ مجھ کو دکھا دکھا کر ہلایا کرتا تھا تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم

کی برابری کرتا تھا۔"

مضمون کی شروعات ہی گفتگو کے لہجے سے ہے۔ پھر چھوٹے چھوٹے مکالماتی جملے: بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا یا آخر میں "بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی برابری کرتا تھا" کا لطف اسی وقت آئے گا جب ان جملوں کی ادائیگی کا لہجہ پیشِ نظر ہو۔ اسی لیے ڈرامے میں ہر مکالمے کے کسی ایک مرکزی لفظ پر زور دیا جاتا ہے کہ پورے جملے کا لہجہ ابھر سکے۔ 'بھلا دیکھو تو' میں 'تو' پر زور دینے سے لہجہ ابھر سکتا ہے۔

خواجہ صاحب نے اگر آسانی کو اسی منزل پر چھوڑ دیا ہوتا اور سیدھی سادی عوامی زندگی کی سیدھی سادی تصویریں کھینچ دی ہوتیں تو بھی وہ ادبی تاریخ میں احترام کے ساتھ یاد کیے جاتے مگر انھوں نے آگے قدم بڑھایا اور ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں گہرائیاں اور انوکھی سچائیاں ڈھونڈھیں، نئی معنویتیں پیدا کیں۔ یہاں ان کی بے پناہ قوتِ مشاہدہ اور ان کے تخیل کی نیرنگی نے کرشمے دکھائے ہیں۔ 'جھینگر کا جنازہ' میں جھینگر کی مونچھوں کا تذکرہ ہے جنھیں جرمنی کے جنگ جو فرماں روا قیصر ولیم کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔ جھینگر کے کتابیں چاٹ جانے کا ذکر ہے کہ اس باب میں وہ انسانوں کے مشابہ ہے کہ کتابیں چاٹ لیتے ہیں اور سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔ پھر اس کی غریبی، خلوت نشینی، حقیر و ذلیل سمجھے جانے کا تذکرہ ہے اور اس کے مر جانے کے بعد اس کی خوبیوں کا چرچا کیا گیا ہے جنھیں خواجہ صاحب کا تخیل ہی اس آن بان کے ساتھ دریافت کر سکتا تھا۔

"بے چارہ غریب تھا۔ خلوت نشین تھا۔ خلقت میں حقیر و ذلیل تھا۔ مکروہ تھا۔ غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا تو کیا؟ امریکہ کے کروڑپتی راک فیلر کے شریکِ ماتم ہو گئے؟ اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا۔ جی دکھایا تھا۔ لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ بوریے کے نیچے آب خورہ کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔ نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا نہ سانپ کا سا ڈسنے والا

بھی، نہ کوّے کی سی شریر چونچ تھی، نہ بلبل کی مانند پھول کی عشق بازی۔ شام کے وقت عبادتِ رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہنا تھا یہ غافلوں کے لیے صور ہے اور عاقلوں کے لیے جلوۂ طور۔ ہائے آج غریب مرگیا، جی سے گزر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدانِ جنگ میں ہے ورنہ اسی کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے کہ موئی مٹّی کی نشانی ایک یہی بے چارہ دنیا میں باقی رہ گیا۔" (جھینگر کا جنازہ)

آخر میں لکھتے ہیں:

"اے فلاسفر، اے متوکّل درویش، اے نغمۂ ربانی گانے والے قوّال! ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اُٹھانے کا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں۔"

یہ محض مزاحیہ ٹکڑا نہیں ہے۔ معنویتوں اور بلیغ معنویتوں سے مالامال نثر ہے۔ اچھے آرٹ کی ایک پہچان یہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ تخیّل آفریں ہوتا ہے۔ وہ تخیل کے لیے نئی جولاں گاہ سامنے لاتا ہے۔ وہ محض متعیّن تصویریں نہیں دکھاتا بلکہ پڑھنے اور سننے والے کے تخیل کو نئی نئی جہتیں تلاش کر لینے پر آمادہ کرتا ہے اور اس کے تخیّل کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر تخیّل کی اس طلسم زائی کا نمونہ ہے جسے غالب کے لفظوں میں گنجینۂ معنی کا طلسم کہا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ طلسم فکری امارت کا نہیں جمہوری نہ داریوں کا ہے، اور اسی تخیّل آفرینی اور طلسم زائی سے خواجہ حسن نظامی کے اسلوب کی چاشنی اور فن کی طرح داری قائم ہے۔ لفظوں کے ہیر پھیر اور اندازِ بیان کی مرصّع کاری کے بغیر خود نفسِ مضمون کے بل پر اپنے فن میں کشش پیدا کرنا صرف اس صورت میں ممکن ہے جب بات میں وزن و وقار ہو اور اسلوب میں بہترہ نہ ہو۔ احساس اور خیال اور جذبہ الگ الگ نہ رہیں۔ پوری شخصیت بن جائیں۔ فراق گورکھپوری نے ایک گفتگو میں عظیم ادب کی تعریف اس طرح کی تھی کہ "قدروں سے بوجھل بنا دینا معمولی چیزوں کو یہ کام ادب کا ہے۔" ہر چیز لامحدود اہمیت اور معنویت کی حامل نظر آنے لگنا، ادبی عظمت کی دلیل ہے۔ قطرے میں دجلہ دکھائی دینے لگے۔ اور جھینگر کی آواز میں نغمۂ ربانی سنائی دینے لگے اور

پڑھنے سننے والا اس معمولی سی شے کی تہوں میں ڈوبتا چلا جائے۔ خواجہ حسن نظامی کا آرٹ یہی ہے۔

یہ بچے کی معصومیت اور بھولے پن کا آرٹ ہے۔ جس طرح دیکھیں اسی طرح دکھائیں۔ جس طرح محسوس کریں اسی طرح لکھ ڈالیں۔ تصنع نہ ہو، بناوٹی پن نہ ہو اور دل میں ڈوب جانے والا بے ساختہ پن ہو۔ یہ سب کہنا جتنا آسان ہے، کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ خواجہ صاحب نے بڑی ریاضت سے یہ ساختہ پن حاصل کیا ہوگا کہ اس کے لیے شخصیت کا آئینے کی طرح شفاف ہونا ضروری ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے خود اپنے بارے میں جس صفائی اور سادگی سے لکھا ہے وہ ان کی شخصیت کے اس پہلو کا آئینہ دار ہے۔ ان کی آپ بیتی میں درگاہ محبوب الٰہی میں جوتیوں کی حفاظت اور ۱۹۱۱ء کے دلی دربار کے موقع پر بیس سیر کا بوجھ سر پر رکھ کر کتابیں اور دہلی کی عمارتوں کے نقشے بیچنے کا ذکر ہی نہیں، اپنی چھوٹی چھوٹی چوریوں تک کا ذکر ہے۔ تھیٹر کے والہانہ شوق کا تذکرہ ہے۔ غرض ایک ایسے دنیادار انسان کی تصویر ہے جسے انسان ہونے پر شرمندگی نہیں ہے اور فرشتہ یا دیوتا بن کر دکھانے کی ہوس نہیں —— یہی کھلا ڈلا پن خواجہ صاحب کی متاعِ ہنر ہے۔

غرض خواجہ صاحب کا فن خواجہ صاحب کی شخصیت کا پروردہ ہے۔ اسی طرح شفاف (Transparent) اسی طرح بے دھڑک۔

اور خواجہ صاحب کی شخصیت ایک مدت تک دلی کا دوسرا نام بنی رہی۔ دلی، راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کے نام سے پہچانی جاتی رہی۔ دلی سے مراد تھی ایک خاص قسم کی گنگا جمنی تہذیب۔ جس میں رکھ رکھاؤ تھا، شیرینی اور مٹھاس تھی۔ سادگی اور دریا دلی تھی۔ تنگ دامانی اور تنگ ظرفی نہ تھی۔ غدر دہلی کے افسانے اور شہزادے کا بازار میں گھسٹنا جیسی تحریریں خواجہ صاحب کی دلی ہیں۔ انھیں شہر سے نہیں تہذیب سے شغف تھا اور تہذیب سے اس لیے کہ وہ ایک مدت کی انسانوں کی محنت اور محبت کا نتیجہ تھی۔ خواجہ صاحب کی دلی ایک الگ موضوع ہے جس پر لکھنے والے لکھیں گے مگر یہاں صرف اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ دلی نے جس اردو زبان کو عام کیا تھا اور جسے ملک کے کونے کونے تک پہنچایا تھا اس کی سادگی اور روانی کو پھیلایا۔ آج اس کے بامحاورہ لہجے کو خود اردو والوں نے بھی بھلا سا دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایک بار پھر اس زبان کی سادگی اور روانی کو خواجہ حسن نظامی کے واسطے سے پہچانا جائے اور کتابی بوجھل پن سے نکال کر اسے پھر سچی اور کھری اردو کا نکھار بخشا جائے کہ یہی خواجہ حسن نظامی کی سب سے بڑی وراثت ہے۔

ڈاکٹر کامل قریشی

خواجہ حسن نظامی اور قومی اتحاد

مصورِ فطرت شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی کی ذات ایک صوفیِ صافی، پیرِ طریقت، مذہبی پیشوا، صحافی، انشاء پرداز، تاریخ و تذکرہ نگار، ترجمہ و تفسیر نویس اور مصلحِ قوم کی حیثیت سے دنیائے علم و ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی ذات کی ہمہ جہتی نے اپنے اندر گوناگوں خصوصیات کو کچھ اس طرح سمویا کہ وہ ایک قوی ہیکل اور قد آور شخصیت کے طور پر زندگی کے مختلف گوشوں پر چھا گئے۔ صوفیِ باصفا، پیرِ طریقت اور مذہبی پیشوا کے روپ میں انھوں نے ان گنت بندگانِ خدا کو فیض روحانی پہنچایا۔ ادیب و انشاء پرداز، تاریخ و تذکرہ نگار، ترجمہ و تفسیر نویس اور صحافی کی حیثیت سے اردو ادب کی وہ خدمت انجام دی جو تاریخِ ادب میں سنہری حروف بن کر روشن ہے اور مصلحِ قوم کی شکل میں اُن کے ذریعہ جو مبارک کام سرانجام ہوئے۔ اُن کی فہرست بھی کچھ کم طویل نہیں۔ ان کی ہمہ گیر طبیعت نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اُس کا بھرپور حق ادا کیا اور بدلے میں وہ اپنے پرستاروں سے زندگی بھر خراجِ تحسین حاصل کرتے رہے۔

گذشتہ چند سالوں میں اہلِ قلم حضرات نے خواجہ حسن نظامی کی زندگی کے مذکورہ مختلف پہلوؤں پر وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ اظہارِ رائے کرکے اُن کے کارناموں کو سراہا ہے۔ اُن کے علم و عمل، فکر و فن اور گفتار و کردار کے نقوش پیش کرکے اُن کی علمی و سماجی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اس طرح خواجہ صاحب کے علمی، ادبی، اصلاحی اور صوفیانہ کارنامے تو منظرِ عام

پر آئے اور ہماری نئی نسل ایک افسوسناک محرومی سے بچ گئی اور کسی حد تک ہی سہی ہمیں خواجہ صاحب کی حیات وخدمات کے تذکرے سے اُن کے اوصاف حمیدہ اور افکار پسندیدہ کو سمجھنے کا موقع ملا مگر اس سب کے باوجود اُن کی زندگی کا ایک اہم پہلو اب بھی تشنہ رہا جس پر خواجہ صاحب زندگی بھر عمل پیرا رہے جو اُن کا مشن تھا جس پر ابھی تک کسی قلمکار یا ادیب کی نظر کچھ اس انداز سے نہیں پڑ سکی جو صحیح حق ادا کرتی اور خواجہ صاحب کے اس میدان کے کارنامے سامنے لاتی۔ خواجہ صاحب کا یہ میدان اُن کی مذہبی رواداری، تمام مذاہب کے ماننے والوں کی یکتائی، باہمی میل ملاپ اور آج کی اصطلاح میں قومی اتحاد کا میدان ہے جس کے وہ آخر دم تک مردِ میدان رہے جس پر کتابیں چھاپیں، اخبار نکالے جس کی تبلیغ میں لگے رہے اور جس کو اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد بنایا۔ اس مضمون میں ہمارا کام انہی باتوں کو احاطۂ تحریر میں لانا ہے جس سے اُن کی وسیع المشربی انسان دوستی، مذہبی رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، انسانی اتحاد اور قومی یکجہتی کے جذبات پر روشنی پڑتی ہے اور خواجہ صاحب کی شخصیت کا اصل روپ اپنے پورے حسن وجمال کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔

خواجہ صاحب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ ایک خانقاہی ماحول تھا جہاں انھوں نے سیکھا تھا کہ خدا رب العالمین ہے سب بندے ایک ہی خدا کی مخلوق ہیں۔ سب سے بلا امتیاز مذہب وملت، رنگ ونسل، محبت ضروری ہے۔ کوئی حقیر و ذلیل نہیں۔ سب کی راہیں مختلف سہی لیکن منزل ایک ہے۔ سب ایک ہی مقام سے آرہے ہیں اور سب کو ایک ہی جگہ لوٹ جانا ہے انھوں نے مسئلہ توحید پر اپنی تحریروں میں بہت سی جگہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ سی پارۂ دل میں بیشتر جگہ یہ خیالات ملتے ہیں "ایکو برہم دوتیو ناستی" کے مضمون میں وہ رقمطراز ہیں "یہ نغرہ جس کے سلیس معنی وحدہٗ لاشریک یا لا الٰہ الا اللہ ہیں ہندو مذہب کے اصول میں داخل ہے اور غور سے دیکھا جائے تو ہر مذہب کی بنا توحید پر ہے۔"[1]

انسانوں کی اصلاح کے لیے خدا نے دنیا میں ہادی اور پیغمبر بھیجے جو مختلف موقعوں پر وقت

---

[1] سی پارۂ دل۔ خواجہ حسن نظامی۔ ایکو برہم دوتیو ناستی۔ ص ۶۵۔۴

ضرورت آتے رہے اور اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچاتے رہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان پیغمبروں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار شمار کی گئی ہے۔ اس بات کے پیش نظر ایکو برہم دوتیو ناستی کے مضمون میں خواجہ صاحب نے کہا ہے کہ:

"ہندوستان کے نامور بزرگوں سری رام چندر جی اور سری کرشن جی اور مہاتما بدھ کے حالات پڑھنے۔ ان کے طرز زندگی پر غور کرنے اور ان کی تعلیمات پر منصفانہ نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے وہی حالات تھے جو سیدنا حضرت ابراہیم و عیسیٰ و موسیٰ وغیرہ علیہم السلام کے پائے جاتے ہیں اور وہی تعلیم تھی جس کا ذکر بار بار قرآن شریف میں آیا ہے[1]۔"

خواجہ صاحب جملہ مذاہب کی روح اور مرکزی تعلیم سے بخوبی آگاہ تھے۔ ہندو مذہب کا انھوں نے بطور خاص مطالعہ کیا تھا۔ اس کے تمام پہلوؤں پر ان کی نظر تھی ور شب و روز کی گہری فکر و نظر کے نتیجے میں وہ جس نقطۂ خیال پر پہنچے تھے انھوں نے اس پر بھی اپنے احساسات پیش کیے ہیں۔ دنیا کے آغاز اور تخلیق کے بارے میں وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"میں ایک مثال دنیا کی پیدائش کی نسبت پیش کرتا ہوں۔ قرآن شریف میں خدا فرماتا ہے کہ ہم نے حکم دیا کن فیکون، ہندو مذہب میں اول برہما پید ہوا۔ اس نے تمام عالم کو ظاہر کیا۔ غور کیجیے کہ ان دونوں بیانات میں کیا فرق ہے۔ کچھ بھی نہیں، متحد البیان ہیں۔ قرآن میں خدا نے صفت خالقیت کو کُن کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور وید میں برہما کے لفظ سے برہما صفت ایجاد کا نام ہے۔ جب تک یہ صفت ظاہر نہیں ہوئی دنیا ناپید تھی جس طرح کُن کے ظہور سے یکون کا ظہور ہوا۔ اسی طرح برہما کے ظہور کے بعد سب کچھ ظاہر ہوا یہی کیفیت تمام اصول مذہب کی ہے[2]۔"

---

[1] ایکو برہم دوتیو ناستی۔ سی پارہ دل۔ خواجہ حسن نظامی۔ ص ۴۶۶

[2] سی پارہ دل۔ ایکو برہم دوتیو ناستی۔ خواجہ حسن نظامی۔ ص ۴۶۷

خواجہ صاحب نے اپنی ان تحریروں میں آگے اس بات کا اظہار کرتے ہوئے کہ دنیا کبھی بھی کسی پیغمبر سے خالی نہیں رہی۔ شریعت ایک تھی لیکن ملکوں کی معاشرت اور حالات کے تحت ہادی اپنے اپنے طریقے کے مطابق لوگوں کو بھلائی کی دعوت دیتے رہے۔ سری رام چندر جی، سری کرشن جی اور مہاتما بدھ بھی خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے ہادی تھے۔ انھوں نے اس دور کے ہندوستان کے حالات کے تقاضوں کے مطابق لوگوں کو اللہ تک پہنچنے کی راہیں بتائیں۔ انسانوں کو جابروں اور ظالموں سے نجات دلائی اور اپنے بعد آنے والے پیغمبروں اور ہادیوں کی نشان دہی اور پیشین گوئی کی۔ حضرت ابراہیم کو اگر نمرود، موسیٰ کو فرعون اور حضرت محمدؐ کو ابوجہل اور کفارِ مکہ سے واسطہ پڑا تھا تو ہندوستان میں سری رام چندر کو راون اور کرشن جی کو کنس کا سامنا ہوا۔ ماحول مختلف ہونے کے باوجود حالات تقریباً ایک ہی قسم کے تھے جن سے یہ ہادیانِ دین دوچار ہوئے۔ خواجہ صاحب نے وید مقدس کا حوالہ دیتے ہوئے لب لباب کے طور پر اس تجزیے کا یہ نتیجہ نکالا۔ ملاحظہ ہو:

> "جس طرح سب پیغمبر ہمارے حضورؐ کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔ ہندوستانی رسولوں نے بھی تصدیق کی ہے پس ہندوستانی رسولوں کی امت کو بھی حضورؐ کی تصدیق کرنی چاہیئے۔ اور ہم کو بھی ہندوستان کے تمام رسولوں پر ایمان لانا چاہیے۔ اسی میں ہندوستان کی ظاہری و باطنی بہبودی ہے اور یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہندو مسلمانوں میں دلی اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔"[۵]

خواجہ صاحب نے ایک وسیع النظر اور روشن خیال صوفی کی حیثیت سے ہندوستانی مذہبی پیشواؤں کے تیرتھ استھانوں کی یاترا، سادھوسنتوں کا لباس پہن کر ۱۹۰۵-۰۶ء میں بڑی عقیدت و شردھا سے کی تھی۔ وہ اپنی یاترا کے دوران متھرا، اجودھیا، بنارس، ہردوار اور رشی کیش گئے۔ وہاں ہندو سنتوں، فقیروں اور روحانی بزرگوں سے ملے۔ ان سے مختلف مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ بڑے بڑے مندروں کو دیکھا اور ہر طرح کے حالات کا جائزہ

۵؎ سی پارۂ دل۔ ایکو برہم دوتیوناستی۔ خواجہ حسن نظامی۔ ص ۶-۴

لے کر لوٹے تو ان کے اپنے ان سے اس درجہ مخالف ہوئے کہ ان کو ہندو، کافر، ملحد کہا۔ کفر کے فتوے لگائے مگر چونکہ وہ بھرپور عزم اور بلند حوصلے لے کر پیدا ہوئے تھے پہاڑ کی طرح جمے رہے اور کسی کی پرواہ کیے بغیر اپنے مشن میں لگے رہے۔ انھیں سرزمین ہند کے ساتھ ہندوستانی مذہبی پیشواؤں سے جو ارادت تھی اس کا پتہ اس سے بھی چلتا ہے کہ انھوں نے جواہر نگار قلم سے جتنے قلمی چہرے تراشے ہیں اور جن سے 'منادی' کے صفحے بھرے پڑے ہیں ان میں ہندوستانی مذہبی پیشوا سری رام چندر، کرشن جی، گرونانک وغیرہ کے چہرے اس قدر حسین و دلکش ہیں کہ اُن سے اُن کی بھرپور شردھا اور گہری عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے اور انھیں بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

نمونے کے طور پر کرشن جی کی تصویر ملاحظہ ہو۔

"متھرا میں آدھی رات کو نکلنے والا چاند، گوکل میں گئو اور بے زبانوں کا نگہبان، بندرابن میں تلوار کھینچ کر کنس پر چڑھ جانے والا خدائی بہادر۔[۱]

من موہن حسن یزدانی کی مورت، رب العالمین جگ داتا کی رحمت عام کا سبق پڑھانے والا، ہندوستان کا سب سے بڑا محبوب، سب سے زیادہ پیارا کرشن کنہیا۔"[۲]

اس لئے ہیں وہ کرشن جی کے من موہنے نقوش بناتے چلے گئے ہیں اور آخر میں بات یہاں ختم کرتے ہیں:

"رسیلی آنکھ! نظر اٹھا اور نگاہ کا ایک تیر اپنے داس کو دے کہ وہ بے تابانہ پکارتا ہے:

اک تیر پھینکتا جا بانکی کمان والے۔"[۳]

---

[۱] منادی۔ شمارہ سالنامہ ۱۹۳۵ء۔ ص ۶۶

[۲] منادی۔ شمارہ سالنامہ ۱۹۳۵ء۔ ص ۶۶

[۳] منادی۔ شمارہ سالنامہ ۱۹۲۵ء۔ ص ۶۰

خواجہ صاحب نے یہ قلمی چہرے مذہبی پیشواؤں، روحانی بزرگوں، ادیبوں، شاعروں، مصلحوں اور مختلف سماجی شخصیتوں کے کچھ اس طرح بنائے ہیں کہ اس فن میں ان کا حریف کوئی نظر نہیں آتا۔ ان کے قلمی چہروں میں، اللہ میاں، حضرت عیسیٰ، حضرت محمدؐ، گرو بابا نانک، مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد، محمد علی جناح، مولانا ظفر علی خاں، مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید وغیرہ بھی شامل ہیں۔ یہاں طوالت سے بچنے کے لئے گرو بابا نانک کی تصویر ملاحظہ ہو:

"سچے خدا کا سچا ولی، توحید کا سمندر، حقانیت کا طوطیٔ ہزار داستان'
پانچ دریاؤں کے ملک میں حواس خمسہ کو شیریں گفتار سے درس وحدت دینے والا'
سکھ فرقے کا بانی۔"

پیغمبرؐ اسلام کے ارشاد کے مطابق کہ تمام قوموں کے پیغمبروں اور مذہبی پیشواؤں کی تعظیم کرو۔ خواجہ صاحب نے ہندوستان کے مسلم بزرگانِ دین اور اولیاء کرام کی عملی زندگی کو اپنے پیش نظر رکھا اور ہر مذہب و ملت کے رہنماؤں کی عزت و تکریم کرتے رہے۔ اپنی تحریروں کے ذریعہ اُن کی تشہیر کو مستقل جاری رکھا۔ اپنے رسالوں، کتابوں، روزنامچوں اور سفرناموں میں ان کے تذکرے برابر بیان کرتے رہے۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح وہ تمام مذاہب کی روحانی قدروں کی تبلیغ و اشاعت کا کام عمر بھر انجام دیتے رہے۔

ایک صوفی' پاکباز کی حیثیت سے ان کی طبیعت میں صلح و آشتی، ایثار و قربانی، خلوص و محبت اور روحانی خیر و برکت کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ انھیں باہمی اختلافات، رنجشیں اور بغض و عناد سے سخت نفرت تھی۔ وہ انسانوں میں تفریق کو گناہ سمجھتے تھے اور تفریق پیدا کرنے والے کو چاہے وہ کتنا ہی بلند مقام کیوں نہ رکھتا ہو ایمان و یقین اور دین دھرم کا دشمن تصور کرتے تھے۔ ان خیالات کی روشنی میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں خواجہ صاحب کی بیزاری کھُل کر نمایاں ہے۔

"میں صوفیوں کے فرقے سے تعلق رکھتا ہوں جس کو جنگ سے دلی نفرت ہے۔ لڑنے والا خواہ کسی ملک اور کسی قوم اور کسی مذہب کا ہو۔ میں اس کے جذبۂ جنگ

کا دلی دشمن ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ انسان خدا کی سرزمین پر خونریزی کرے
مجھ کو اس خیال سے بھی تکلیف ہوتی ہے کہ آدمی چار دن کی فانی زندگی کے لیے
اور اس کی دولت و عزت کے واسطے اپنے ہم جنس بھائیوں کا خون بہا دے۔"[1]

خواجہ حسن نظامی کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ سبھی شامل تھے۔ ان میں علماء، صوفیاء، صحافی، ادیب، شاعر، تاجر، لیڈر، انگریز حکمراں و افسران وغیرہ ہر قسم کے افراد تھے خواجہ صاحب کی جاذب نظر شخصیت ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو اپنا بنا لینے کی کشش رکھتی تھی خود خواجہ صاحب بھی بہت جلد دوسروں کے ہو جاتے تھے۔ دوست بننے اور بنانے کا گر انھیں خوب آتا تھا۔ ان کی زندگی میں بیشتر ایسے مشاہیر کے نام ملیں گے جن سے ان کے نہایت گہرے مراسم تھے اور ان میں کچھ ایسے بھی تھے جن سے اُن کو اختلافات بھی ہوئے۔ مولانا محمد علی، مہاتما گاندھی، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، پنڈت جواہر لعل نہرو، محمد علی جناح، سردار پٹیل، ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی، مولانا آزاد، انگریز گورنرز، حکام اعلیٰ و بالا، شیعہ طبقے کے مجتہدین اور دیگر بہت سے معروف و غیر معروف حضرات بھی ان کے ملاقاتیوں اور واقفوں میں تھے۔ مولانا محمد علی سے بحیثیت صحافی ان کی معاصرانہ چشمک رہی۔ مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح سے سیاسی نظریوں پر ان کا اختلاف ہوا۔ علامہ اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد اُن سے ٹھن گئی۔ سردار دیوان سنگھ مفتون جو دنیائے صحافت میں انہی کے لائے ہوئے تھے کچھ معاملات میں ان سے بھی شدید اختلافات رہے۔ سوامی شردھانند سے شدھی تحریک کے سلسلے میں آمنا سامنا ہوا اور شدت سے اختلافات ہو گئے۔ مگر یہ سب اختلافات اصولی اور نظریاتی قسم کے ہوتے تھے علاوہ ازیں اُن کے دشمنوں کی کمی نہ تھی جنھوں نے اُن پر کئی بار قاتلانہ حملے کیے۔ ان کے منادی کے جواب میں سنادی، حمادی او۔ اڑادی کے مختلف رسالے بھی نکالے اور اُن کو زک دینے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے تعلقات مخالفوں سے خوشگوار بھی ہوئے لیکن آریہ سماجی لیڈر سوامی شردھانند سے شدھی کی تحریک کے معاملے میں شدت کی معرکہ آرائی رہی۔ سوامی جی شدھی

---

[1] خواجہ حسن نظامی۔ لڑائی کا گھر یعنی یورا میگزین۔ ص ۲

میں انتہا پسند تھے تو خواجہ صاحب نے اسلامی تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ خواجہ صاحب یہ محسوس کرتے تھے کہ کوئی تحریک چلا کر کسی مذہب کے پیروؤں کو ورغلانا یا اپنے مذہب میں شامل کرنا سوسائٹی میں نئی کشمکش پیدا کرنا ہے اس لیے اس کی مزاحمت ضروری ہے۔ یہی سبب تھا کہ خواجہ صاحب شدھی کی انتہا پسندی کا جواب اپنی تبلیغ سے دیتے رہے۔ حق و انصاف کی آواز بلند کرنے میں وہ کبھی گھبرائے نہیں اور نہایت بے باکانہ انداز سے اپنے مشن پر چلتے رہے۔ وہ جس بات پر لگ جاتے یا جس چیز پر اڑ جاتے تھے اسے پورا کر کے چھوڑتے تھے جس کا انہیں اعتراف ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"میرے اندر ضد اور ہٹ کا مادہ پایا جاتا ہے اور اس کو بعض حالات میں برا سمجھتا ہوں۔ باوجود رائے کی بے استقلالی کے ضد کا یہ عالم ہے کہ جب ایک بات ٹھان لوں اور اس پر اڑ جاؤں تو خواہ وہ کیسی ہی نامناسب ہو اس سے دست بردار نہیں ہوتا اور اس پر اڑا رہتا ہوں۔"[1]

ضد اور ہٹ کی اور بات لیکن یہ سچ ہے کہ خواجہ صاحب جتنے حلیم الطبع، صلح کل، امن پسند اور دریا دل واقع ہوئے تھے اتنے ہی وہ اپنے اصولوں میں کٹر تھے۔ وہ آسانی سے جھکنے والے نہ تھے۔ وہ مجتہد کا ذہن لائے تھے جو تقلید کا تابع نہیں ہوتا وہ اپنی بات منوانا اور اپنے اصولوں پر عمل کرانا خوب جانتے تھے۔ اس سلسلے میں اُن کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے۔

"میں اس قسم کے لوگوں سے بات چیت کرنی پسند نہیں کرتا تھا جو دوسرے مذہب کی دل آزاری جاری رکھتے ہوں میرا مذہب صلح کل ہے سب قوموں سے ملنساری برتنی چاہتا ہوں لیکن اگر کوئی خواہ مخواہ حملہ کرے تو منصفانہ جواب دہی میرے عقیدے میں ضروری ہے۔"[2]

خواجہ صاحب چونکہ توحید کے علمبردار تھے اس لیے سارے بندوں کو ایک خدا کی مخلوق

---

[1] خواجہ حسن نظامی۔ آپ بیتی۔ ص ۱۰۹

[2] سفرنامہ مصر و شام و حجاز۔ خواجہ حسن نظامی۔ ص ۱۰

تصور کرتے تھے۔ جملہ مذاہب کے پیشوا، روحانی بزرگ۔ ان کی کتابیں اور زبانیں بھی اُسی ایک ہی خدا کی عطا کردہ ہیں اس لیے۔ بندہ اگر اُسے کسی بھی راہ سے اپنا خدا مانے۔ خدا کی خدائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اسے یاد کرنا شرط ہے وہ سب کی سنتا ہے۔ وہ سب کی دعائیں قبول کرتا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں اگر خواجہ صاحب کی مندرجۂ ذیل مست الست کی دعا کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اس کی لسانی وادبی شان تو اپنی جگہ۔ اس کا تاثر اس قدر شدید اور دلکش ہے کہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور ہم روحانیت کی دنیا میں کھو جاتے ہیں —— ملاحظہ ہو:

"ہے پربھو پرشوتم پرم آتما! اگر تو نرگن ہے تو ہم کو سگن بنا دے۔ نراکار ہے تو ہماری موہوم شکلیں بھی مٹا دے۔ سگن بن جا، ساکار ہو جا اور اپنی پریم شکتی کو دنیا میں پرگٹ کر۔ ہم کس سے فریاد کریں تیرے سوا کس کو دیکھیں۔ اے مکہ کے سیاہ پوش مکان پر نظر خاص رکھنے والے، اے صلیب کی صورت کو عزت دینے والے، اے ہر دوار کے دوارے سہنے والے تجھ کو ہم یقین دلاتے ہیں تو ہی ہے اور کوئی نہیں ہے۔ تو نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اور جو کچھ ہے کچھ بھی نہیں تو ہی تو ہے اور بس۔"[1]

اس کے علاوہ بندوں کی زبان سے دعا کے یہ الفاظ بھی کس قدر پُرتاثیر اور اثر انگیز نظر آتے ہیں۔ ذرا دیکھیے:

"تجھ کو داتا کہیں، تجھ کو مولا کہیں، تجھ کو داور کہیں تجھ کو کیا کچھ کہیں تو ہر ہے اور ہر سے آزاد، تو ہندو کا برہم اور اوم اور مسلمان کا اللہ، عیسائی کا گاڈ، سکھ کا اکال پورکھ، تو امیر اور غریب کو ایک نگاہ سے دیکھنے والا ہے۔ ہماری دعا اور پرارتھنا سن اور قبول کر۔"

دعا کا ایسا انداز بھی ملاحظہ ہو جس سے خواجہ صاحب کی وطن دوستی اور مذہبی رواداری

---

[1] سیپارۂ دل، مست الست کی دعا۔ خواجہ حسن نظامی۔ ص ۳۵

کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد کے جذبۂ نیک پر روشنی پڑتی ہے۔

"ہندو مسلم کی تازہ کوشش اتحاد میں برکت ہو، دونوں کے دلوں کو
خلوص عطا فرما، ذات کی رنجش اور خود غرضیاں بیچ میں نہ آنے دے۔"

خواجہ صاحب نے جہاں دعاؤں کو ایک ایسا روپ دیا ہے جن میں خدا اور ایشور کا جلوہ ایک ہی نظر آتا ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ اُس ایک خدا اور ایشور کو ماننے والے بھی ایک ہی لَے میں اسے پکار رہے ہیں۔ اُس کے آگے سربسجدہ ہیں وہاں اُس کے محبوب پیغمبروں کا ذکر بھی کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ وہ انیک ہو کر بھی ایک نظر آتے ہیں اور سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ "مدنی شیام سندر کی مُرلی" اس سلسلے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ سنیے اور بتائیے کہ یہ گوکل کے شیام کی تصویر ہے یا میر حجاز کی شبیہ مبارک یا یہ ایک دوسرے میں اس قدر گھل مل گئی ہیں کہ پہچان مشکل ہے۔

"شیام نے مُرلی بجائی کس طرح۔ بج گئی گھر گھر دہائی کس طرح
ہر کی مرلی ہر کے اندر باجتی۔ ہر کی ہے ہر سے رسائی کس طرح
زلفوں والے پریتم پیارے، سرب باشی موہن کنہیا کی بانسری کے بلہاری
حجازی پربت میں کھڑے ہو کر ایسی بجائی کہ جنم جنم کے دکھ کلیش دُور ہو گئے
رُوح آتما، جیو، شریر سب کو سرشار و پُر کیف بنا دیا۔"[1]

یہاں تک اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنے نظریۂ زندگی اور صوفی مشن کے جو نقوش پیش کیے ہیں وہ جملہ مذاہب سے اُن کے دلی لگاؤ، مادر وطن سے محبت اور قومی اتحاد کے آئینہ دار ہیں۔ حیرانی اس بات کی ہے کہ اب تک خواجہ صاحب کی علمی و ادبی خدمات کے بیان تک ہی اُن کا ذکر کیوں محدود رکھا گیا۔ قومی ایکتا اور مذہبی رواداری کے میدان میں انھوں نے زندگی بھر جو تبلیغ جاری رکھی اُسے منظر عام پر کیوں نہ لایا گیا۔ قومی خدمات کے اس باب میں ان کی زندگی کا یہ گوشہ تاریکی میں ہے۔ نہ صرف نپی تلی باتوں پر اکتفا کر کے حق ادا

---

[1] سیپارۂ دل۔ خواجہ حسن نظامی (مدنی شیام سندر کی مرلی۔ ص ۱۰۲

کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس میدان میں تحریری خدمات کے علاوہ ان کی دیگر عملی خدمات کا ذکر بھی کیا جائے۔

خواجہ صاحب دلی والے تھے۔ اُن کو دلّی سے والہانہ عشق تھا۔ دلی کی گنگا جمنی تہذیب میں اُن کی پرورش ہوئی تھی۔ بائیس خواجہ کی چوکھٹ پر انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ ۱۸۵۷ء کے حالات پر انھوں نے آنسو بہائے۔ لوگوں کو رلایا۔ محفلیں سجائیں، جلسے کیے، دھومیں مچائیں، خواجہ صاحب، خواجہ میر درد کی طرح تادم آخر دلی ہی میں رہے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے سایۂ دامن میں جگہ پائی۔

یوں تو ہندوستان ہی نہیں ملک کے باہر بھی اُن کے دوستوں کی کمی نہ تھی۔ ایک اندازے کے مطابق اُن کے دوستوں، معتقدوں اور مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی جن میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل تھے۔ ان میں انگریز بھی تھے، راجے مہاراجے اور نواب بھی تھے۔ خاص طور پر کئی انگریز گورنر، گورنر جنرل، نظام حیدر آباد، نواب رام پور، مہاراج الور وغیرہ تو ان کے احباب خاص، معتقد اور مرید تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد مدار المہام حیدر آباد تو ایسے مریدوں میں تھے جنھوں نے اپنے بڑے بیٹے کا نام خواجہ صاحب پر خواجہ پرشاد ہی رکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ملک کی مختلف ریاستوں اور صوبوں میں ان کے عقیدت مندوں کی کثیر تعداد تھی جو کبھی خواجہ صاحب کو اپنے یہاں بلاتے اور مختلف موقعوں پر خواجہ صاحب کی خدمت میں دہلی حاضر ہوتے۔ خواجہ صاحب انہیں ہر طرح نوازتے اور وہ خواجہ صاحب سے اپنی نیازمندی کا اظہار کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کی شخصیت میں ایسا جادو تھا کہ جو اُن سے ایک بار مل لیتا ہمیشہ کے لیے ان کا ہو جاتا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بجا فرمایا ہے:

"خواجہ صاحب کے متعلق بعض لوگ کہتے تھے کہ انھیں عملِ تسخیر آتا تھا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ایک انسان کا حسنِ عمل، حسنِ اخلاق و محبت، بے لوث جذبۂ خدمت، سچی ہمدردی اور غمگساری یہ سب اوصاف و کمالات ہزار اعمال کے ایک عملِ تسخیر ہیں۔ خواجہ صاحب اُن اوصاف و کمالات کے پیکر تھے۔ اُن سے

کسی کی مصیبت اور تکلیف برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ان کے ہاں ہندو اور مسلمان امیر و غریب، کالے اور گورے کا کوئی فرق اور امتیاز نہ تھا۔[1]

ملک کے دوسرے صوبوں کے علاوہ دہلی میں بھی خواجہ صاحب کے دوست اور ارادت مند ہر مذہب و ملت سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں ہندو کثرت سے تھے جن سے اُن کے گہرے مراسم تھے رائے بہادر لالہ پارس داس جو غالباً آنریری مجسٹریٹ بھی تھے اور کنور رنجیت سنگھ جو کسی ریاست کے ولی عہد تھے۔ ان دونوں سے خواجہ صاحب کے گھریلو تعلقات تھے۔ دونوں خواجہ صاحب کے ذاتی مشوروں میں بھی دخیل تھے۔ آنکھوں کے ڈاکٹر متھراداس جنھوں نے خواجہ صاحب کی آنکھ کا بھی آپریشن کیا تھا اور بابو کیشپ چندر وکیل جو بعض معاملوں میں خواجہ صاحب کے مشیر رہتے تھے۔ ان دونوں صاحبان سے بھی خواجہ صاحب کو تعلق خاطر قائم تھا۔ پنڈت سندر لعل جو ہندو مسلم اتحاد کی تحریک میں خواجہ صاحب کے ساتھی تھے اور مہنت رام کشن داس (اداسین آشرم) پٹنہ والے کا شمار بھی ان لوگوں میں تھا جن کو خواجہ صاحب کی ذات سے تقرب خاص حاصل تھا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات دلی کے زمانے میں جب بستی حضرت نظام الدین اولیاء کو خطرہ کا سامنا ہوا تو خواجہ صاحب کے کہنے پر سردار پٹیل نے بستی میں مدراس رجمنٹ لگادی تھی۔ جو امن قائم ہونے تک وہاں رہی۔ سردار پٹیل اور جنرل کری اپا خود بھی بستی کی دیکھ بھال کے لیے آئے۔ مہاتما گاندھی اور خواجہ صاحب کے درمیان بھی ادب و احترام کے رشتے قائم تھے دلی میں گاندھی جی کا جب قتل ہوا تو خواجہ صاحب اس زمانے میں حیدرآباد تھے۔ انھوں نے آغا حیدر حسن دہلوی کے ہمراہ جب نظام کالج میں ایک تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا تو وہاں مخالفت کی گئی جس کا خواجہ صاحب نے سختی سے مقابلہ کیا اور جلسہ ہوا۔ خواجہ صاحب نے گاندھی جی پر اپنے مخلصانہ اور دوستانہ خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو سے بھی خواجہ صاحب کو گہری محبت تھی اور وہ ان کی بہت قدر کرتے تھے۔

---

[1] مولانا سعید احمد اکبرآبادی: خواجہ حسن نظامی میری نظر میں (آجکل خواجہ حسن نظامی نمبر) ص ۱۹۔ فروری ۱۹۵۶ء

علاوہ ازیں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی، منشی مہاراج بہادر برق، پنڈت تربھون ناتھ زار دہلوی، لالہ سری رام ایم اے، لالہ شمبھوناتھ دہلوی اور دیگر لاتعداد ہندو، شاعروں، ادیبوں، صحافیوں اور دانشوروں سے بھی خواجہ صاحب کے گہرے مراسم تھے۔ سکھوں میں دیوان سنگھ مفتوںؔ تو دہلی میں انھی کے لائے ہوئے تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کا تعلق بھی ان کی ذات سے گہرا تھا۔ خواجہ صاحب کے روزنامچوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو مسلمانوں کے علاوہ اُن کے بیشتر ایسے ہندو احباب کے نام نکل آئیں گے جو مسلمانوں سے زیادہ ان کے قریب تھے۔ اور جن سے خواجہ صاحب اس قدر پیار کرتے تھے کہ ان کے دُکھ سُکھ میں بھی شریک رہتے تھے۔ ان میں کٹرہ ارادت مند خان (کٹرہ امیران) کے کنہیا نمبردار بھی تھے جن کے لڑکے تیج رام کی نوکری کا مسئلہ جب خواجہ صاحب کے سامنے آیا تو انھوں نے ہورٹی کلچر ڈیپارٹمنٹ کے دفتر سے یہ کہہ کر سفارش کی کہ تیج رام میرا لڑکا ہے، اسے نوکری ملنی چاہیے جس پر متعلقہ افسر بہت متعجب ہوا اور تیج رام کو نوکری مل گئی۔ غالباً ۱۹۲۴ء میں دتی میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ اُس وقت بستی نظام الدین اولیاء میں ہندوؤں کے صرف دو مکان تھے جس میں ایک لالہ سلّرھ مل جین کا تھا جن کے وارثوں میں لالہ سلطان سنگھ جین حیات ہیں۔ خواجہ صاحب نے اُس فضا میں ان کی اس طرح حفاظت کی کہ اُن کے مکانوں کے سامنے اپنی چارپائی بچھا دی اور جب تک امن قائم نہیں ہوا وہ وہیں رہے۔

خواجہ صاحب اسلام کی مذہبی رواداری، وسیع المشربی، فراخ دلی اور دوست نوازی کی اعلیٰ مثال بن کر اپنے ہندو دوستوں اور عقیدتمندوں سے ملتے تھے۔ انھوں نے غیر مسلموں کے سامنے ہمیشہ اسلام کا وہ عملی روپ پیش کیا جو ان کی شخصیت میں موجود تھا اس کے لیے انھوں نے بہت کچھ کیا، اُن کی اِسی کوشش کی ایک کڑی قرآن شریف کا ترجمہ اور تفسیر تھی تاکہ غیر مسلم قرآن کی اصل روح کو ہندی زبان میں سمجھ سکیں اور اسلام اور قرآن کے پیغام کو اپنے دل میں جگہ دیں اور جن باتوں سے ہندو مسلم دونوں طبقوں کے درمیان دُوری ہو گئی ہے وہ ختم ہو اور ہر مذہب و ملت کے لوگ ایک دوسرے کے مذہبی رہنماؤں کی عزت کریں اور ایک خدا کو مانیں۔

خواجہ صاحب کی جامع الصفات شخصیت بہت سے کمالوں کا مجموعہ تھی۔ وہ عالم تھے۔ صوفی تھے، ادیب و انشاپرداز تھے۔ اخبار نویس و مصلح قوم تھے اور سب سے بڑھ کر ایک ایسے انسان تھے جو اپنے ہم وطنوں کو بلالحاظ مذہب و ملت، رنگ ونسل اور افکار و نظریات ایک مرکز پر جمع ہونے اور ایک دوسرے سے میل محبت پیدا کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ وہ ہندوستان کے رہنے والے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ کی خیر و برکت اور نجات ایک دوسرے کے مذہبوں کے احترام اور مذہبی پیشواؤں کی عزت میں سمجھتے تھے وہ زندگی بھر اسلام اور ہندو دھرم، سکھ ازم اور عیسائیت کی اعلیٰ قدروں کو دنیا والوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔ عملی طور پر ملک کے تمام طبقوں سے اُن کے برادرانہ تعلقات رہے۔ وہ مظلوموں اور دکھیوں کی آواز بنے۔ پسماندہ طبقوں کی دادرسی کے لیے انھوں نے ہمیشہ کوششیں کیں قومی اتحاد، ملکی سالمیت، وطن پرستی اور انسان دوستی کے صالح جذبات کی تشہیر کے لیے انھوں نے زندگی بھر کام کیا۔ ہندو مسلم اتحاد اُن کی زندگی کا ایک ایسا سنہرا خواب تھا جو اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا نعرہ انھوں نے ایک اصطلاح یا فیشن کے طور پر نہیں بنایا تھا۔ وہ اسے ایک مبارک فرض اور نیک مقصد سمجھتے تھے جس کے لیے وہ زندگی کے آخری لمحے تک کام کرتے رہے۔ ان خیالات کی روشنی میں ہمیں جناب مظفر حسین برنی کے مندرجہ ذیل الفاظ سے حرف بہ حرف اتفاق ہے جن سے خواجہ صاحب کی گنگا جمنی شخصیت اور اُن کے قومی اتحاد کا مشن نمایاں ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"خواجہ صاحب دلی کی تہذیب کا سانس لیتا ہوا نمونہ تھے ——— اس تہذیب کی نمایاں خصوصیات میں وضعداری، سلیقہ، رواداری، انسان دوستی، اخلاقی اقدار پر پختہ یقین، غم گساری، بھائی چارہ اور صلح جوئی ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب ساری عمر اپنی زبان سے اور اپنے قلم کی توانائی سے ان نیکیوں کو عام کرتے رہے۔ وہ ایک خانقاہی آدمی اور مذہبیات کے عالم تھے مگر ان کے ملنے والوں میں ہر مذہب و ملت کے افراد تھے اور اپنے ہندو، سکھ یا

عیسائی معاصرین سے بھی اُن کے تعلقات ایسے خلوص، شرافت اور انسان دوستی پر مبنی تھے کہ اُن کے قصے سن کر آج بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ وہ محبتیں، وہ اخلاص، وہ بے نفسی اور ایثار پیشگی، وہ دیانت اور شرافت پھر زندہ ہو جائے۔[1]

---

[1] مظفر حسین برنی، خطبۂ صدارت (ماہنامہ آجکل۔ خواجہ حسن نظامی نمبر) ص ۴۲۔ فروری ۱۹۷۷ء

ڈاکٹر ماجدہ اسد

خواجہ حسن نظامی اور ہندوستانی ثقافت

لفظ ثقافت میں بڑی وسعت اور گہرائی ہے۔ اگرچہ سنسکرتی سنسکار کا ایک فعل ہے اور اپنے اصل معنی ہی میں یہ مستعمل ہے لیکن یہ صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا مفہوم سماج اور زندگی کی ہمہ جہتی اصلاح، نشو ونما اور ارتقار پر بھی حاوی ہے۔ اس کا اطلاق کھانے پینے پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے نیز علم وادب، فن وفکر، عمل، طور طریقہ، سیاست، فلسفہ، مذہب اعتقاد، معشیت وغیرہ غرض کہ سماجی اور غیر سماجی لوازمِ زندگی پر بھی ہوسکتا ہے اور ان سب کا تعلق محض اصلاحِ بشر اور اس کی نشو ونما اور ارتقائے حیات سے ہے۔

ہندوستان ایک ایسا گلشن ہے جس میں رنگا رنگ پھول کھلے ہیں۔ پھولوں کے رنگ چاہے بھلے ہی الگ الگ ہوں لیکن ان سب پھولوں کی مہک ایک ہے۔ اس طرح ہندوستانی ثقافت کا تعلق ایک گنگا جمنی تہذیب سے رہا ہے۔ جس کی آبیاری میں مختلف قوموں اور مذہبوں کا ہاتھ رہا ہے۔ اس کو اگر ایک طرف رشیوں، منیوں نے اُجاگر کیا ہے تو دوسری طرف اس کے سنوارنے میں صوفی سنتوں کا اہم رول رہا ہے۔

خواجہ حسن نظامی سے شرفِ ملاقات تو حاصل نہیں ہوا البتہ آٹھ سال کی عمر میں ۱۹۴۷ء میں میں نے ان کی لکھی مس چڑیا کی کہانی ضرور پڑھی تھی۔ اس کے تاثرات میرے لاشعور سے ضرور وابستہ رہے۔ ان دنوں گھر میں اکثر روزنامچوں کا تذکرہ بھی ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب

کی شخصیت کا خاکہ میرے ذہن میں کچھ اس طرح اُبھرتا ہے۔ آپ ہاتھ میں قلم لیے ہوئے کاغذ پر لکھ رہے ہیں۔ دوات پاس رکھی ہے۔ کمر گاؤتکیہ سے لگی ہے۔ جناب کے گیسو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نام کی طرح دراز ہیں۔ چہرہ ذہین، ہنس مکھ اور گول ہے۔ طبیعت آزاد اور ذہن مست ہے۔ بے تکلفی، بے نیازی اور سادگی شیوہ ہے۔ بات چیت میں حاضر جوابی، بے باکی و بے ساختگی ہے۔ مزاج میں اپنائیت اور بے لوثی ہے۔ کردار صوفی سنتوں کی طرح بھید بھاؤ سے دُور پیار و محبت سے بھرپور ہے۔

خواجہ صاحب کی شخصیت ان کی تمام تصانیف میں نمایاں نظر آتی ہے۔ مصنف جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے جہاں اس کا ذہن پروان چڑھتا ہے وہی ماحول اور عہد اس کی تصانیف کی خصوصیت بن جاتا ہے۔ ویسے بھی خواجہ صاحب زمانہ شناس اور دور بیں انسان تھے۔ انھوں نے آنے والے دَور کی نبض کو پہچان لیا تھا اور شاید اسی بنا نے انھیں ایک اہم کام کی طرف رجوع کیا کہ انھوں نے اس دَور میں جب ہر طرف اردو کا بول بالا تھا، ہندی میں قرآن شریف کا ترجمہ کرا کر شائع کیا۔ یہ ان کا بہت بڑا اور نمایاں کارنامہ ہے۔ قومی یکجہتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختلف قومیں ایک دوسرے کے مذہب اور مذہبی کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ خواجہ صاحب نے ہندی میں قرآن شریف کا ترجمہ کرکے بہت سے لوگوں کو اس سے روشناس کرایا اور ہندی کی اہمیت کو اس وقت محسوس کرکے اس اہم کام کو انجام دیا۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ ترجمہ بہت اچھا، عام فہم اور آسان ہے۔

اردو زبان کے بارے میں غیر اردو داں طبقے کو یہ عام شکایت رہی ہے کہ اس زبان نے اپنی دھرتی سے کم اور عرب و عجم سے زیادہ واسطہ رکھا۔ اس کی تلمیحات، تشبیہات، موضوعات الفاظ و بیان میں عربی و فارسی کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن خواجہ حسن نظامی صاحب کی تصانیف کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ الزام بے بنیاد سا نظر آتا ہے۔ ان کی تصانیف کا موضوع ہندوستانی دیوی دیوتا، ہندوستانی مذہب و فلسفہ، ہندوستانی سیاست، معاشرت و تمدن، عشق و محبت، سوز و گداز، ہندوستانی موسم و مناظر قدرت ہندوستانی تیر تھ و زیارتیں ہیں۔ اور جب وہ ان سب چیزوں کے بارے میں قلم اُٹھاتے ہیں تو اس کی نوک سے نکلے

والے الفاظ بھی ہندی ہوتے ہیں۔ سنسکرت کے الفاظ کا بے تکلف استعمال بھی ان کی خصوصیت ہے۔

ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عکّاسی ان کی ہر تصنیف میں کسی نہ کسی روپ میں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے ہندو مذہب کے اوتار شری رام چندر اور شری کرشن کے بارے میں لیکچر دیے۔ ان کی مشہور کتاب کرشن بیتی ہے جو بعد میں کرشن جیون کے نام سے شائع ہوئی اور جسے انھوں نے اپنے الفاظ میں اس طرح مہاتما گاندھی کی خدمت میں پیش کیا۔ "یہ کتاب بھارت کے سیوک اور اپنے دلی دوست من موہن پرجادھنی مہاتما گاندھی کے اسم مبارک کے ساتھ ملکی اتّحاد کی یادگار کے طور پر نہایت خلوص و پریم سے منسوب و معنون کرتا ہوں۔" (حسن نظامی، حجرۂ رین بسیرا۔ ۸ر نومبر ۱۹۱۹ء)

آج ملک میں ہر طرف قومی یکجہتی اور ملکی اتّحاد کی بات ہوتی ہے۔ اس ملکی اتّحاد کی ضرورت کو خواجہ صاحب نے نصف صدی سے پہلے سمجھ لیا تھا۔ ویسے بھی صوفی سنت دور بیں اور پوشیدہ باتوں کے جاننے والے ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی صوفی نظر نے اس اتّحاد کی ضرورت کو پہچان لیا تھا۔

اس کتاب کے دیباچے میں مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر سابق وزیر اعظم حیدر آباد دکن لکھتے ہیں۔ "حضرت خواجہ نے اس قدیم مذہب کی اور اس مذہب کے ایک سچے ہادی کی کس بے تعصبی اور دلسوزی سے خدمت انجام دی ہے۔ اور ہندو مسلمانوں کو اس پاکیزہ خیالی اور بے تعصّبی کی کس درجہ قدر کرنا لازم و واجب ہے۔" خواجہ صاحب کرشن بیتی کے بارے میں کہتے ہیں: "میں نے شری کرشن جی مصنف گیتا کی بیتا لکھی ہے۔ وہ ہندو تھے میں مسلمان ہوں۔ مگر میرے مذہب اسلام کی تلقین، علم اور اہلِ علم کی محبت سکھاتی ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب میں ہو اور ہوں۔" خواجہ صاحب کی فراخ دلی اور ہندوستانی ثقافت سے محبّت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے ۲۰ برس ہندوؤں کے ذریعے ان کے دین و دنیا کے مطالعے میں صرف کیے۔ ایک جھولی، ڈنڈا، کمبل لیے ہوئے وہ متھرا، بندرابن، گوکل، شری کرشن کی جائے پیدائش برسوں رہے۔ ہردوار، اجودھیا اور بنارس میں بھی برسوں

گھومے۔ انھوں نے ان اعتراضات کا جواب بھی اپنی اس کتاب میں دیا جو عام طور پر ہندوؤں پر کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے حبّ الوطن من الایمان (ملک کی محبّت ایمان ہے) اسلام کے اس اصول کو مانا اور ہندوؤں کے مذہب کو معاشرت و تصوّف کے اعتبار سے بیس سال تک اس لیے پڑھا کہ وہ ان کے ملک کا حصّہ تھے۔ انھیں اپنی قدیم وراثت سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اپنے پرانے وطن عرب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: "چار برس ہوئے جب میں اپنے پرانے وطن میں گیا تو اس کو بہت ہی پیارا پایا۔ بے اختیار میرا دل اس پر آیا لیکن میں نے ہندوستان کو وہاں بھی دل سے الگ نہیں کیا۔ اس آنکھوں کی ٹھنڈک پر بے توجہی و بھول کا پردہ نہیں ڈالا۔ میں نے وہاں ہند کے بادلوں، بجلیوں کو یاد رکھا۔ برسات کی مستانہ ہواؤں، کوئل اور مور کی آوازوں، تالاب کے مینڈکوں کی صداؤں کو خیال میں لایا۔ اور محبت کا ٹھنڈا سانس لے کر اپنے جنمی وطن کو مُڑ مُڑ کر بارہا دیکھا۔ خوش ہوں۔ میرا عرب سلامت ہے، خوش ہوں میرا ہندوستان سلامت ہے۔"

کرشن بیتی میں شری کرشن کی شخصیت کا تجزیہ مختصر الفاظ میں اس طرح کیا گیا ہے:

"ہندوستان میں جس قدر اوتار اور رہنما گزرے ہیں، ان سب میں شری کرشن باعتبارِ صفات گوناگوں ممتاز تھے۔ ان کی عمر کا پہلا حصّہ مظہرِ حسن و عشق تھا۔ درمیانی حصّہ دورِ رزم و بزم کا مکمل آئینہ تھا۔ آخری وقت محویت فنایت دنیا اور تعلقاتِ دنیا سے بے خبری کا تھا۔" اس کتاب میں والہانہ جذبات اور عقیدت کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے واقعات اور آخر میں بھگتوں کی پوری فہرست پیش کی ہے۔ آخری صفحے پر ہندوؤں کے اوم میں علی کا تصور پیش کیا ہے۔ سنسکرت رسم الخط میں اوم کی یہ تحریر کوفی رسم الخط میں لفظ علی سے بالکل مشابہ دکھائی دیتی ہے۔ ॐ

خواجہ صاحب نے رام اُپدیش عنوان سے سی پارۂ دل میں صفحہ ۱۴۱ پر وہ تقریر پیش کی ہے جو رام چندر جی نے سولہ سال کی عمر میں ایک جلسے میں کی تھی۔

ہندو فلسفے کی جھلک سی پارۂ دل میں بارہا دیکھنے کو ملتی ہے۔ 'ایکو برہم دو تیو ناستی' عنوان جس کے معنی وحدہٗ لاشریک یا لا الٰہ الا اللہ ہیں۔ یہ عقیدہ ہندو مذہب میں ہے۔ غور سے دیکھا جائے

توہر مذہب کی بنیاد توحید پہ ہے۔ خواجہ صاحب نے ہندو مذہب اور قرآن شریف کی تھیوری کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر بیان کیا ہے۔ قرآن شریف میں کُن اور وید میں برہما جس طرح کُن کے ظہور کے بعد یکون کا ظہور ہوا، اسی طرح برہما کے ظہور کے بعد سب کچھ ظاہر ہوا۔

بھگتوں کا ایک عقیدہ ہے کہ بھگوان بھگتوں کے بس میں ہوتے ہیں اسی لیے ہندی کے مشہور شاعر رسخان کی گوپیاں شری کرشن کو چھچھیا بھری چھاچھ پر ناچ نچا رہی تھیں اور رادھا شری کرشن سے اپنے پیر دبوا رہی تھیں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب اس بات کو اپنے انداز میں کہتے ہیں: "بھگت کے بس میں آ بھگوان یا رحمٰن یا سبحٰن تیری سمرن جیوں آگے سیبس دھروں کیسے بھگتی کروں۔ اے بھگوان" صفحہ ۴۷

مست الست کی دعا میں ہندوستانی رنگ پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں "ہے ایشور پرشوتم پرم آتما۔ اگر تو نرگن ہے تو ہم کو سگن بنا دے نراکار ہے تو ہماری موہوم شکلیں بھی مٹا دے سگن بن جا۔ ساکار ہو جا اور اپنی پریم شکتی کو دنیا میں پرگھٹ کر" صفحہ ۳۵۔ ہندی بھگتی کے دونوں روپ سگن اور نرگن سے خواجہ صاحب پوری طرح واقف تھے۔ گیان کتھا میں کرم، عمل، گیان، موکش و نجات کا فلسفہ ہے۔ "جب ہر چیز اپنی غرض اور ذاتی مطلب کے لیے متحرک ہے تو تو کیوں پریشان ہوتا ہے۔ کرم کر، عمل کر، گیان موکش نجات سرورِ ابدی عمل و حرکت میں ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ حرکت میں برکت ہے۔" صفحہ ۲۱

اسی طرح "حجازی پربت پر شری کرشن کے مرلی بجانے سے جنم جنم کے کلیش دُور ہو گئے۔ روح، آتما، جیو، شریر سب سرشار و پُر کیف ہو گئے"۔ جنم جنم کے کلیش اور دُکھ دُور ہونے کا تصور خالص ہندوستانی تصور ہے۔ ہندو مذہب میں ایک جنم اور انیک یونیاں مانی گئی ہیں۔

ہندوستانی سیاست و معاشرت و تمدن کو خواجہ صاحب نے "تاج کلاہ درویشی دربار کی یادگار" میں شاہ جارج کو مبارکباد دے کر پیش کیا ہے۔ اسی طرح "سوئی کی لن ترانی" میں بھی سیاست کی گونج سنائی دیتی ہے۔ "تخت گاہ کے ایک تختے کا پیام وائسرائے کے نام" میں ہندوستانی سیاست کی عکاسی ملتی ہے۔ اس دور کی بدحالی کی تصویر خواجہ صاحب اس طرح پیش کرتے ہیں "اتنے میں ایک برقعہ والی پاس سے گذری۔ دامنوں میں سینکڑوں پیوند، ٹوٹی جوتی

بغل میں ٹوپیوں کی بقچی بازار گئی تھی، بیوپاری نے خریدنے سے انکار کردیا اور کہا مندا ہے۔ لڑائی کے موسم میں کسی چیز کی نکاسی نہیں۔ حیران پریشان گھر چلی ہے۔" صفحہ ۵۴۵

" بیگمات کے آنسو" کتاب میں اس دور کی بیگمات کی بدحالی پڑھ کر پڑھنے والے کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ جن شہزادیوں کی طرف آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ تھی، ان کے زیور چھینے جارہے تھے۔ جن کو انھوں نے پالا پوسا تھا، انھوں نے گھر میں پناہ دینے اور پہچاننے سے انکار کردیا تھا۔

عشق و محبت اور سوز و گداز میں ہندوستانی ثقافت کی جھلکیاں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ "پتی کی ستی بی بی عائشہ رضؓ کی افسردگی دیکھی نہیں جاتی۔ ست پتا کی جائی۔ ست پتی کی من موہنی۔ برج کائنات کے سب سے بڑے شام سندر کی منظور نظر صدیق رضؓ کی گود میں پلنے والی، آغوشِ نبوت کے تخت کی ملکہ کیسی اداس، مایوس، نڈھال، سر رسول کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ آج اس کی راجدھانی ہاتھوں سے چھین رہی ہے۔ آج اس کا دھن دنیا سے منھ موڑ رہا ہے۔ پتی کی ستی عائشہ رضؓ ہم تیرے ست کے قائل ہیں۔ تو بھی صدیقہ ہے۔ ایک دفعہ آگ میں جل کر مرجانا آسان ہے مگر ساری عمر پتی کے کام میں لگا رہنا اس کو انجام پر پہنچانا تیرا ہی حصہ تھا۔" صفحہ ۲ ۔ یہاں الفاظ کے ذریعے سوز و گداز پیدا کیا گیا ہے اور ہر لفظ بامقصد اور بامعنی ہے۔ پتی کا ستی نمونے میں ستی پرتھا کی طرف اشارہ ہے۔

سسرال میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی اپنے باپ کو یاد کرتی ہے اور باپ سے شکوہ کرتی ہے۔ "اچھی بابل کیا لاڈلی بیٹی کو بھول گئے۔ میرا سہاگ لٹ گیا۔ میری راجدھانی مٹ گئی۔ میں بے وارث رہ گئی، ہری ہری چوڑیاں اُتر گئیں۔ میں بیوہ دکھیا رانڈ کہلانے لگی۔" صفحہ ۹۷

"آپ بدھوا بیاہ کے حامی ہیں۔ میرے لیے بھی فکر کیجیے۔ اچھی بابل میرا بیاہ رچادو۔ اچھی بابل مجھے مہندی منگادو۔ اچھی بابل میرا منڈھا چھوادو۔ سب برتنوں کے بانس کٹواؤ۔۔۔ سب باموں کے پھول پتے منگواؤ۔ مجھے سہاگ کی چوڑیاں پہناؤ۔ اپنی لاڈلی کو بھول نہ جاؤ۔" صفحہ ۹۸

منڈھا چھوانے کی پوری رسومات سے خواجہ صاحب واقف تھے اور سہاگ کی نشانیوں سے بھی۔ ہندوستان میں کوّے، بھونرے اور بادل سندیسہ پہنچانے کا کام کرتے رہے ہیں۔ کالی داس کی مشہور تصنیف میگھ دوت میں بادل بکش کا پیغام لے کر جاتا ہے۔ ملک محمد جائسی

کی مشہور تصنیف پدماوت میں ناگ متی، بھونروں اور کوؤں سے سندیسہ بھجواتے ہوئے کہتی ہے کہ اے بھونرے ! او کوے، میرے پیارے یہ سندیسہ دینا کہ تمھاری بیوی تمھارے فراق کی آگ میں جل رہی ہے اور اس کے دھوئیں سے ہم کالے ہو گئے ہیں۔

سی پارۂ دل میں بھی کاگا مدینہ نگری کو سندیسہ پہنچاتا ہے۔ "پردیسی پریتم دیکھی تہاری پریت" اور "رس کے بھرے تورے نین" اس طرح کے سارے عشقیہ بیانات میں ہندوستانی گوری کی روح مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہندوستانی موسم اور مناظرِ قدرت خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے گرمی برسات کی عکاسی کرتے ہوئے کہا ہے۔ "چمک، کڑک، گھنگھور گھٹاؤں کی قسم۔ برسات کا موسم آگیا۔ جون کی گرمیاں گئیں۔ جولائی کی سیرابیاں نمودار ہوئیں۔ . . . کیوں رے ابر تو آیا میرے پیارے کو نہ لایا۔ برسات وہ اچھی جس میں پُر ساتھ ہو ورنہ ہیچ . . . . مور بولتے ہیں کوئل کی آواز آ رہی ہے۔ مینڈک ندی نالابوں میں کچھ پکار رہے ہیں۔" سیپارۂ دل صفحہ ۱۱۰ - ۱۱۱۔

"ہردواری گنگا کے کنارے چنتا من مورتی" میں گنگا کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ نہانے والوں کا میل کچیل صاف کر رہی ہے۔ پانی اٹکھیلیاں کرتا ہوا بہہ رہا ہے۔ "شملہ کی دیبی ماتا کے بیان" میں ہندوستان کے پہاڑ نیند کی آغوش میں سو رہے ہیں۔ ہندوستانی پھولوں چنبیلی گلاب کے ساتھ کیکر کا تذکرہ بھی ہے۔ شبنم اوس کی شکل میں روز رات کو سبزے پر چھا جاتی ہے۔ الّو، مرغ، مکھی، مچھر اور جھینگر کی آوازیں یہاں کے ماحول میں گونجتی ہیں۔

خواجہ صاحب نے ہندوستانی دھوبی کی زندگی کو بہت فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے بیان میں برج کے گیتوں کی چاشنی ہے:

رام جھروکے بیٹھ کے سب کا مجرا لے
جیسی جا کی چاکری ویسا وا کو دے صفحہ ۳۰۵

سائیں مت جانیو توہے چھوڑت موہے چین
گیلے بن کی لاکڑی سلگت ہوں دن رین صفحہ ۳۰۶

دھوبن دھوبی سے پوچھ رہی ہے۔ "ننوا کے بابو۔ یہ رات چکوا چکوی آپس میں کیا

باتیں کرتے تھے۔ میں نے تو اتنا سُنا کہ چکوا جمنا کے اس پار اپنی چکوی کو پکارتا تھا اور چکوی اس پار اپنے چکوے کو۔" صفحہ ۲۰۷۔ کپڑے دھونے کی آواز اور اس پورے سین کو حسین انداز میں پیش کیا گیا ہے "چھوا چھو۔ چھوا چھو۔ چھوا چھو۔ یہ تن وہ من تو دھوبن میں دھوبی۔ سب ہیں ساجن تو دھوبن میں دھوبی۔" صفحہ ۲۰۴۔ لوک کتھاؤں کا سارنگ اس اندازِ بیان میں ملتا ہے اور روانیِ الفاظ بھی۔

ہندوستانی ثقافت کو پیش کرتے وقت خواجہ صاحب جس زبان کا استعمال کرتے ہیں اگر اسے ناگری رسم الخط میں لکھ دیا جائے تو وہ ہندی کہلائے گی۔ مثال کے طور پر "شام سندر مرلی لیے بن سے نکلا۔ وہ ہمارے سیناپتی تیر کمان سنبھالے نمودار ہوئے۔ اب کوئی دم میں مُرلیا باجے گی اور نین کی بدلی برسے گی۔ ندی نالے سوکھے تھے۔ گنگا جمنا پیاسی تھیں، گھٹ کے تیرتھ سونے تھے۔ بھگتی کا نغا کال پڑا۔ مست کے گلے جنجال پڑا۔ اب مرگ ترشنا دور ہوئی اور چنتا من کا فور ہوئی۔ اب ہر ہر کی آمد ہے۔ اب ہر کی آمد آمد ہے۔ سنسار کا داتا آتا ہے اور ہر کا جھنڈا لاتا ہے، بانس کی مُرلی شور ہے یہ اور ریتک کا مسطور ہے یہ۔" صفحہ ۱۰۲۔ ہندی الفاظ کا استعمال بامحاورہ اور فطری انداز میں کیا گیا ہے۔

سی پارۂ دل میں خواجہ صاحب نے خصوصیت کے ساتھ اس بات پر توجّہ کی ہے کہ ایسی چیزوں کو یکجا کر سکیں جو ہندو مذہب اور اسلام کے ساتھ مطابقت رکھتی ہوں۔ وہ کہتے ہیں "ہندوستان کے نامور بزرگ شری رام چندر جی، شری کرشن اور مہاتما بدھ کے حالات پڑھنے، ان کی طرزِ زندگی پر غور کرنے اور ان کی تعلیمات پر منصفانہ نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے وہی حالات تھے جو سیدنا حضرت ابراہیم و عیسیٰ و موسیٰ علیہم السلام کے پائے جاتے ہیں اور وہی تعلیم تھی جس کا ذکر بار بار قرآن شریف میں آیا ہے۔" صفحہ ۲۶۶

قومی یکجہتی خواجہ صاحب کا نصب العین تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔ "ہم کو ہندوستان کے تمام رسولوں پر ایمان لانا چاہیے۔ اسی میں ہندوستان کی ظاہری اور باطنی بہبودی ہے اور یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ہندوؤں کا مسلمان اور مسلمانوں کا ہندو ہونا مشکل ہے نہ اس بیان سے میری یہ غرض ہے میں تو

صرف یہ چاہتا ہوں کہ ان دونوں قوموں کی باہمی نفرت و اجنبیت دُور ہو۔ ہر ایک دوسرے کے پیشوا کی عزت کرے اور گلے ملنے کے لیے پہلے مسلمانوں کا قدم آگے بڑھے"۔ صفحہ ۴۷۸۔

خواجہ صاحب نے ہندوستانی ثقافت اور ہندی اندازِ بیان کو بڑے دلکش پیرایے میں پیش کیا ہے۔ اس سب کے پس منظر میں اُن کی شخصیت، ماحول، موضوع، مقصد اور مخاطب سب کے رنگ نمایاں جھلکتے ہیں اور ساتھ ہی ہندوستانی تہذیب اور مشترکہ کلچر پوری آب و تاب کے ساتھ روشن اور نمایاں نظر آتا ہے خواجہ حسن نظامی صاحب کو قومی یکجہتی کی نمائندہ مثال کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر شارب ردولوی

خواجہ حسن نظامی

ایک صاحبِ طرز انشا پرداز

خواجہ حسن نظامی اردو کے صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ ان کے اسلوب میں بلا کی شگفتگی اور دلکشی ہے۔ اور انھیں اس پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ دنیا کا کوئی موضوع ہو، وہ اسی سادگی اور بے تکلفی سے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ جس طرح نظیر اکبر آبادی نے شاعری میں کسی موضوع کو نہیں چھوڑا خواہ وہ کتنا ہی غیر شاعرانہ کیوں نہ رہا ہو، اُسے پوری شعری کج ادائی کے ساتھ نظم کیا، اسی طرح کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر خواجہ حسن نظامی نے کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو، پھر "یہ کچھ نہ کچھ" ایسا نہیں ہے جسے کوئی نظر انداز کر سکے۔ انھوں نے اگر کسی موضوع پر ایک صفحہ یا نصف صفحہ بھی لکھا ہے تو اس لکھنے کی آن بان دہی ہے۔ انھیں زبان پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ جب چاہتے ہیں موضوع کو چند سطروں میں سمیٹ لیتے ہیں اور جب اس بات کو طول دینا چاہتے ہیں تو ایسی بات میں بات پیدا کرتے ہیں کہ پڑھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> "ان مضامین میں خواجہ صاحب کسی سے باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں وہ اپنے سے ہم کلام ہیں، کہیں راز و نیاز ہے، کہیں دردِ دل کی داستان ہے اور اپنا اور ہمارا دکھڑا رو رہے ہیں۔ . . . . کہیں تخیل کا زور عرش تک لے گیا، کہیں نثر میں وہ شاعری کی شان دکھائی کہ نظم مقفیٰ اپیچ ہے۔"[1]

ان کے مضامین کا سب سے بڑا حسن ان کا اسلوب ہے۔ وہ بڑے ذی علم انسان تھے۔ مذہب، تصوف، قرآن، حدیث، فلسفہ، منطق اور دوسرے مذاہب کی کتابوں پر ان کی گہری نگاہ تھی لیکن اپنے مضامین میں وہ

---

[1] مقدمہ سی پارۂ دل۔ ص ۹-۱۰

عالمانہ، یا فلسفیانہ گفتگو نہیں کرتے بلکہ ایک عام انسان کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ یہ بڑا مشکل کام ہے کہ کسی کی علمیت کا اظہار اس کے الفاظ و تراکیب سے نہ ہو۔ ایک بار چودھری محمد علی ردولوی نے کہا تھا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری زبان زندہ رہے اور ترقی کرے تو اس زبان میں لکھو جو زبان تم بولتے ہو۔ اس بات کا کہنا جتنا آسان ہے کرنا اتنا آسان نہیں لیکن اردو میں اگر کسی کی تحریر اس بات پر پوری اترتی ہے تو وہ خواجہ حسن نظامی کی تحریر ہے۔ میر نے کہا تھا۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

خواجہ صاحب کا بعینہٖ یہی حال تھا۔ ایک طرف امراء و روساء نوابین اور ابن زادے ان کے مداح و معتقد تھے، دوسری طرف عوام ان کے مرید اور مقلد لیکن امراء و نوابین کے لئے انھوں نے اپنی زبان اور اسلوب نہیں بدلا۔

ایک اچھے اسلوب کے لئے ماہرین فن نے حسن ادا، سادگی، قطعیت، اختصار، زور بیان، بذلہ سنجی اور گداز (Patho s) یعنی جس سے دوسرے ہمدردانہ طور پر متاثر ہوں ضروری قرار دیا ہے۔ ان عناصر میں اگر کسی فنکار کے یہاں کسی عنصر کی کمی بھی ہے تو بھی وہ صاحب طرز ادیب قرار پائے گا۔ مثلاً رجب علی بیگ سرور یا مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں سادگی، اختصار اور بذلہ سنجی کی کمی ملے گی۔ اس کے باوجود ان کے صاحب طرز ادیب ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن خواجہ حسن نظامی کے اسلوب میں یہ تمام باتیں مل جاتی ہیں۔ ان کے مضامین کسی بہت معمولی عنوان سے شروع ہوتے ہیں اور جس طرح وہ اس موضوع کو شروع کرتے ہیں اس سے محسوس ہوتا ہے کہ مضمون کا تعلق اسی بات سے ہے جسے نام بنایا گیا ہے لیکن رفتہ رفتہ مضمون کی تہیں کھلتی جاتی ہیں اور اختتام تک پہنچتے پہنچتے اُس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے مثلاً ان کا ایک چھوٹا سا مضمون "ہچکی" ہے جسے اس طرح شروع کیا ہے۔

"تو کیوں آتی ہے؟ میرا سمجھا تو یاد نہیں کرتا، بمرے من موہن سندر کے دل میں تو میرا خیال نہیں آیا؟ ۔۔۔۔۔۔۔ پھر آئی ــــ ہچکی ــــ نہ ستا، میرا سینہ ناتواں ہے، اس میں جگہ جگہ پھانسیں چبھی ہوئی ہیں، تو آتی ہے تو سینے میں کھٹک ہوتی ہے۔ اس کے زخم دکھنے لگتے ہیں، سانس رکا جاتا ہے۔" [1]

دو صفحے کے اس مضمون میں ہر ہچکی پر ایک نیا رخ سامنے آتا ہے۔ یہاں تک کہ آخری ہچکی زندگی

---

[1] ہچکی۔ مشمولہ سیپارۂ دل

کی آخری ہچکی بن جاتی ہے اور سارا جن اور صیاد کائنات کے ذرے ذرے میں پوشیدہ خالقِ عالم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے اس مضمون میں جو سادگی، قطعیت، اختصار اور گداز ہے وہ کسی دوسری جگہ مشکل سے نظر آئے گا۔ خواجہ صاحب کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے ہر مضمون کے اندر زنجیر کے حلقوں کی سی کیفیت ہے جو ایک ایک حلقے کی شکل میں الگ الگ بھی ہیں اور زنجیر کی شکل میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بھی۔ یعنی ان کے مضمون کا ہر پیراگراف زنجیر کی حلقوں کی طرح الگ بھی ہے اور ایک مربوط مضمون کا حصہ بھی، ان کے کسی مضمون کو شروع کرنے کے بعد درمیان میں چھوڑ دینا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ ہر لمحہ ذہن ایک نئے تجربہ سے دوچار ہوتا ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اب آگے کیا بات کہی جانے والی ہے مثلاً ریل سے ہم آئے دن سفر کرتے ہیں لیکن جب خواجہ صاحب ریلوے لائن اور سگنل کو دیکھتے ہیں تو ان کا تاثر بالکل مختلف ہوتا ہے:

"جی آئی پی ریلوے کی لائن آئی، سگنل نے اپنی لال آنکھ دکھائی، اس کا پھیلا ہوا ہاتھ دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ جو اپنا ہاتھ دوسروں کے آگے پھیلاتا ہے اس کی زندگی کا راستہ رک جاتا ہے جیسے اس سگنل کے پھیلے ہوئے ہاتھ کے سبب ریل اس سڑک پر نہیں آسکتی۔"[۱]

یا ان کے مضمون 'لمپ' میں ان کے اسلوب کی تازگی اور دلکشی ملاحظہ کیجیے:

"لمپ ایک ڈبیہ کا نام ہے خواہ وہ لوہے کی ہو یا کانچ کی، اس میں تیل بھر دیتے ہیں اور بیچ میں بتی اٹکا دیتے ہیں۔ پھر اس پر کانچ کی چمنی لگا دی جاتی ہے۔ یہ روشنی کا حجاب ہے اس کے اندر بی بتی بی روشنی کا تاج سر پر رکھ کر ملک ظلمات فتح کر کے حکومت کرتی ہیں۔

پروانے بے چارے اس روشن تاج کے دیوانے ہیں۔ دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں اور کانچ کے سفید پردے سے ٹکرا کر گر پڑتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں شمع کے رخ پر جو حجاب لٹکایا جاتا تھا، وہ دور سے اور نزدیک سے پردہ ہی معلوم ہوتا تھا، مگر آج کل چونکہ دنیا ہی دھوکے کی ہے۔ یہ پردہ بھی دھوکے کی ٹٹی ثابت ہوتا ہے۔ ننھے سے پرندے کو روشنی بے حجاب نظر آتی ہے لیکن جب قریب جاتا ہے تو غریب مایوس

---

[۱] سیپارۂ دل۔ صفحہ ۸۴

ہو کر گر پڑتا ہے اور منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔" ؎۱

بات میں بات پیدا کرنے کا فن انھیں خوب آتا ہے۔ الفاظ کے ایسے نبض شناس ہیں کہ بعض جگہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لفظ معنی کے لئے ان کا محتاج ہے۔ وہ ہماری زندگی کے کسی بہت معمولی سے موضوع یا آئے دن کی ضرورت کی کسی چیز کو لے لیتے ہیں اور اس میں دنیا جہان کا فلسفہ، تصوف، وحدانیت، محبت، سیاست، تعلیم، تدریس، طنز، ظرافت اور زندگی کے نکات اس طرح پیدا کرتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ ان کے سیدھے سادے جملوں اور معصوم عبارت میں ایک جہان معنی پوشیدہ نظر آتا ہے۔ معنی و مفاہیم کی اس تہہ داری کے باوجود ان کے اسلوب کی سادگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مثلاً ان کے مضمون "لا" کی یہ چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

"انگریزی زبان میں اسی سم بلند لفظ کے معنی قانون اور ضابطے کے ہیں۔ عرب والے انکار اور نفی کے وقت اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اہلِ اردو تحکمانہ طلب کے موقع پر "لا" بولتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ عرب کا "لا" صور اسرافیل ہے۔ انگریزی لا کی اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں، ایک ہی ضرب میں حکومت کے "لا" کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔ حکومت کے "لا" کی اسامی کیا جو عربی لا کے سامنے آسکے۔" ؎۲

ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز کے اسلوب کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ گڑھا ہوا اسلوب نہ معلوم ہو۔ بعض لوگ انفرادیت پیدا کرنے کے لئے اپنے اسلوب کو ایک خاص انداز کا بنانے کی کوشش کرتے ہیں یا کسی کے اسلوب سے متاثر ہو کر اس جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً بہت سے لوگوں نے غالب کے خطوط سے متاثر ہو کر اسی طرح اپنا ایک اسلوب بنانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوتے۔ فسانۂ عجائب میں رجب علی بیگ کا اسلوب فطری طور پر پرورش پایا ہوا اسلوب نہیں ہے۔ مہدی افادی کی نثر بڑی خوبصورت سہی لیکن ان کے اسلوب میں بھی آورد ہے، فطری آمد نہیں ہے۔ لیکن خواجہ حسن نظامی کے یہاں ایسا بے ساختہ اسلوب ہے جس میں کہیں ایک لمحے کے لئے بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ انھیں اپنے اسلوب کو برقرار رکھنے کے لئے کسی طرح

؎۱ سیپارۂ دل۔ ص ۱۵۲، ۱۵۱

؎۲ سیپارۂ دل۔ ص ۱۷۸-۱۷۷

کی کوشش یا کاوش کرنی پڑ رہی ہے۔ مثلاً ان کے مضمون 'دیا سلائی' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"آپ کون ہیں؟ ناچیز تنکہ۔ اسم شریف؟ دیا سلائی کہتے ہیں۔ دولت خانہ؟ جناب دولت ہے نہ خانہ۔ اصلی گھر جنگل ویرانہ تھا۔ مگر چند روز سے احمد آباد میں بستی بسائی ہے اور سچ پوچھیے تو یہ ننھا سا کاغذی ہوٹل جس کو آپ بکس کہتے ہیں اور جو آپ کی انگلیوں میں دبا ہوا ہے، میرا موجودہ ٹھکانہ ہے۔ . . . . . . میرے مذہب میں دیسی بدیسی گورے کالے کا فرق بھی جائز نہیں۔ مندر میں میرے دم سے روشنی ہے اور مسجد میں بھی۔ راجہ اور نواب کے محل کی تاریکی بھی دور کرتی ہوں اور غریب کے جھونپڑے میں بھی میرے سبب سے اُجالا ہوتا ہے۔"[1]

یا جھینگر کے جنازے کا یہ اقتباس دیکھیے جس میں سادگی بھی ہے۔ بذلہ سنجی بھی۔ زورِ بیان بھی ہے گداز بھی۔ طنز بھی ہے اور اختصار بھی۔

"ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحاتِ مکیّہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا۔ اچھل کر بولا۔ ذرا اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ سبحان اللہ تم کیا خاک اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا۔ واہ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر ان کو سمجھتے ہیں اور نہ عمل کرتے ہیں . . . . . . یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔ جھینگر کی بات سُنکر مجھ کو غصہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ واہ خفا ہو گئے۔ بگڑ گئے۔ لاجواب

---

[1] سیپارۂ دل۔ ص ۱۵۹

ہو کر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔"[۵۱]

ڈاکٹر عابد علی عابد نے اسلوب کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اسلوب کو محض اندازِ نگارش یا طرزِ بیان کہہ دینے سے پوری بات واضح نہیں ہوتی بلکہ (Stendhel) کے مطابق اسلوب کے معنی ہیں کہ فنکار کسی سلسلہ فکر کے اظہار کے وقت وہ تمام کوائف شامل کرے جو سلسلہ فکر کے کامل ابلاغ کے لیے ضروری ہیں۔"[۵۲]

اس اقتباس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ اس کی روشنی میں خواجہ حسن نظامی کے اسلوب کا بہتر تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اگر ان کے اسلوب کو صرف طرزِ بیان یا اندازِ نگارش کہہ کر بات ختم کر دی جائے تو وہ اس انفرادی اسلوب کی بات ہوگی جس کے بارے میں گذشتہ صفحات میں بنائے ہوئے اسلوب کی بات کہی گئی ہے کہ بعض لوگ خاص طرح کے الفاظ، تراکیب، اصطلاحات یا محاورات کے استعمال کو اپنی شناخت بنا لیتے ہیں لیکن خواجہ صاحب کے یہاں اسلوب کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ ان کے یہاں ایک نظامِ فکر ہے۔ تصوف ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے اندر انسانیت کا درد تھا۔ وہ کسی کو پریشان، بیمار یا بھوکا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انھیں بدلتے ہوئے زمانے کا شعور تھا۔ ان میں سیاسی بصیرت بھی تھی اور مذہبی فکر بھی۔ مذہب کے معاملے میں وہ بڑے وسیع النظر تھے۔ ان کی نگاہ میں سارے انسان برابر اور سارے مذاہب کسی نہ کسی شکل میں عرفانِ الٰہی کے حصول کے لئے کوشاں تھے۔ اپنے ان تمام محسوسات اور جذبات کو بیان کرنے کے لیے انھیں اپنے اسلوب پر پوری قدرت تھی اور انھیں افکار کی وجہ سے ان کے اسلوب میں وسعت فکر بھی ہے سادگی اور دلکشی بھی۔ اس کے علاوہ چونکہ ان کے مخاطب عوام ہیں اس لیے ان کے یہاں فلسفیانہ موشگافیوں کے بجائے دلچسپ انداز اور دل میں اُتر جانے والی بات ہے مثلاً ان کے

---

[۵۱] سیپارۂ دل۔ ص ۳۰۰۔ ۲۹۹

[۵۲] ڈاکٹر عابد علی عابد۔ اسلوب ص ۴۳

ایک مضمون "مٹی کا تیل" کی یہ سطریں ملاحظہ کیجیے۔

"اے خاک نشیں تیل ہم کو تیری یہ ادا بھاتی ہے کہ جہاں آگ قریب آئی اور تو مشتعل ہوا۔ خدا کی قدرت ہے کہ تجھ میں یہ صلاحیت ہے کہ تو آن کی آن میں شعلہ رسار بن کر مقبول ہو جاتا ہے اور انسان کی یہ قسمت کہ برسوں ٹکریں مارتا ہے۔ پہاڑوں اور دریاؤں میں سرگرداں پھرتا ہے مگر وہ تجلی نصیب نہیں ہوتی جو وجود خاکی کو جلا کر فنا کر دے۔"[1]

یا ایک مشکل موضوع "نقطہ یا صفر" پر کس بے ساختگی اور دلکشی سے لکھتے ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے:

"کسی نے حرف "بے" سے کہا کہ تجھ میں اور "تے" "ثے" میں کیا فرق ہے۔ صورت تینوں کی یکساں ہے۔ تفاوت فقط اس کا ہے کہ "بے" کے نیچے ایک نقطہ اور "تے" کے اوپر دو نقطے "ثے" کے اوپر تین نقطے؟ "بے" نے جواب دیا یہی سوال میں نے الف سے کیا تھا کہ جب تو اکیلا تھا تو تیرا مطلب بھی ایک نکلتا تھا لیکن جس وقت تیرے پہلو میں ایک نقطہ بڑھایا گیا تو معنی دس گنے ہو گئے دوسرا نقطہ اور زائد کیا تو ایک سو ہو گئے۔ تیسرا نقطہ بڑھا تو ہزار بن گئے یہ کیا بھید ہے۔"[2]

خواجہ حسن نظامی کے اسلوب کی ایک خوبی ان کا طنز و مزاح ہے۔ وہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع میں طنز و مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں اور اسی طرح غیر ادبی موضوعات میں گداز و (Pathos) کا پہلو پیدا کر دینے میں قدرت رکھتے ہیں۔ یہ بات زبان پر ان کی مکمل گرفت اور اپنے مخاطب کی نفسیات سے پوری واقفیت کی نشاندہی کرتی ہے۔ ان کے مضامین میں اس طرح کی انگنت مثالیں موجود ہیں۔ خاص طور پر "آغوش مچھر میں شب عید"، "مکھی"، "الو"،

---

[1] سیپارۂ دل۔ ص ۱۵۴

[2] سیپارۂ دل۔ ص ۲۴۵

جھینگر کا جنازہ، دیا سلائی، اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ ان کا اسی طرح کا ایک مضمون "دوا کی شیشی کے باطنی اشارے" ہے جس میں بیمار ہونے پر جب ڈاکٹر انصاری کے پاس علاج کے لیے گئے تو اپنے ڈاکٹری معائنے اور ڈاکٹر کی تشخیص کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

"جب ڈاکٹر انصاری نے کان میں وہ آلہ چڑھایا جس کو کان کی عینک کہنا چاہیئے اور حسن نظامی کے سینے کو دیکھنا شروع کیا تو حسن نظامی کی آنکھ نے ڈاکٹری ساز و سامان سے باتیں شروع کیں اور ان سے کچھ سنا۔ گویا ڈاکٹر صاحب کے کان نے دیکھا اور حسن نظامی کی آنکھ نے سنا۔"[1]

خواجہ صاحب کے اسلوب میں جو شگفتگی اور تازگی اور ان کے موضوعات میں جو تنوع اور رنگا رنگی ہے وہ اردو میں آپ اپنی مثال ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے مضامین میں ہنساتے ہیں لیکن مسخرے نہیں لگتے۔ رُلاتے ہیں لیکن مرثیہ گو نہیں معلوم ہوتے تعلیم دیتے ہیں لیکن مدرس نہیں لگتے۔ مذہب کی بات کرتے ہیں لیکن محتسب یا واعظ نہیں بنتے۔ تصوف کا ذکر کرتے ہیں لیکن چھری پر قل ہو اللہ دم کرنے والے نہیں معلوم ہوتے۔ ان کی تحریروں میں خلوص و محبت کی چاشنی، انسان دوستی کی دل پذیری، زبان کی فصاحت و روانی اور خیال کی ندرت و جدت نے انھیں ایسا اسلوب دیا ہے جو آج بھی قابلِ تقلید ہے اور زبان کی بقا اور مقبولیت کے لئے ہمیشہ قابلِ تقلید رہے گا۔

---

[1] سیپارۂ دل۔ ص۔ ۲۳

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

فرعونی تاریخ

(خواجہ حسن نظامی کا ایک نہایت اہم ادبی و تاریخی کارنامہ)

خواجہ صاحب کی میزانِ قدر میں متصوفانہ عقائد و اعمال کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ اُن کی ذہنی زندگی کے رشتے ان کی ادبی فکر فرمائیوں اور علمی مطالعوں سے ناقابل شکست طور پر وابستہ رہے اور آخر وقت تک ان کے قلم کی روشنائی خشک نہیں ہوئی۔

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحون عشق　　سطح دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

سنسکرت ادب میں قلم کو آبشار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ خواجہ صاحب کا قلم بھی آبشار کی طرح زندگی کی روحانی قدروں اور مادی حقائق کے مابین ایک روشن خط کھینچتا ہوا نظر آتا ہے۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں جب دوسری عالمی جنگ کے خوفناک سائے اپنے تباہ کن اثرات کے ساتھ ادھر سے اُدھر تک پھیلے ہوتے تھے خواجہ صاحب اپنی اس تاریخی کتاب کی تکمیل و اشاعت کے اہتمام میں مصروف تھے جسے خواجہ سید علی نظامی نے اہلِ بیت پریس دہلی میں چھاپ کر دفتر ایک آنہ اردو یونیورسٹی دہلی سے شائع کیا اور ملنے کا پتہ منتظم دفتر "لوحِ محفوظ" اردو لائبریری دہلی درج کیا گیا۔

اس وقت خواجہ صاحب کی عمرِ عزیز کے ساٹھ اور پانچ پینسٹھ برس بیت رہے تھے اور وہ، چھوٹی بڑی دو سو کے قریب کتابوں، کتابچوں اور رسالوں کے مصنف بن چکے تھے۔ اس پر بھی انہیں اپنی اس عجیب و غریب تصنیف کی اشاعت سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کے اس غیر معمولی شوق و شغف کا اظہار اس کے ڈیڈی کیشن کی عبارت سے بھی ہوتا ہے:

"میں نے فرعونی تاریخ کی ابتدا سنہ ۱۹۱۱ء میں خود مصر جا کر شروع کی تھی اور انتہا اب ۱۹۴۲ء

میں ہوئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ میرے خاص شوق کی کتاب ہے۔"

اس کا انتساب خواجہ صاحب نے آنریبل مسٹر اسکوئیتھ چیف کمشنر دہلی کے نام سے کیا ہے تاکہ انتساب ان کی ذاتی دوستی کی ہمیشہ کے لئے ایک یادگار بن جائے۔ جس کے ساتھ مسٹر اسکوئیتھ کی تصویر بھی شامل ہے کہ آج اس کی بھی ایک اہمیت ہے۔

صفحہ تین سے لے کر تیرہ تک دس صفحات میں فرعونی تصویر نامہ ہے۔ اس میں ان چھپن تصویروں کا تعارف نامہ دیا گیا ہے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ طریقۂ کار بھی سمجھایا گیا ہے جو ان تصاویر سے اخذ معانی وحصول نتائج میں معاون ہو سکتا ہے۔ اس عمل میں جس حد تک تعبیرات و قیاسات کو دخل ہے اسی نسبت سے اختلاف رائے کی گنجائش بھی نکل سکتی ہے۔ خود اس تعارفی تبصرہ میں جو خواجہ صاحب نے سپردِ قلم فرمایا ہے، اس اختلافِ رائے کی پرچھائیاں بھی موجود ہیں جو ان تصویروں کے بارے میں خواجہ صاحب کے ذہن یا ان کے زمانۂ زندگی میں اہلِ علم کے مابین پایا جاتا تھا۔

ان تصاویر یا ان سے متعلق مجسموں کے بارے میں ضروری معلومات خواجہ صاحب نے اپنے سفرِ مصر کے دوران فراہم کی ہوں گی۔ لیکن اس سلسلۂ معلومات میں ۱۹۱۱ء کے بعد آنے والے ماہ وسال میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اس زمانہ کے اخبارات اور کتب ورسائل کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض مصر کے مقبروں تک رسائی اس کے بعد ہی ممکن ہوئی ہے۔ خواجہ صاحب نے ایک آدھ موقعہ پر اس ضخیم گائڈبک کا بھی ذکر کیا ہے جو سیکڑوں صفحات پر مشتمل تھی اور جس میں مصر کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی نادر اشیاء کی تصویریں موجود تھیں۔ بعض امور کی وضاحت میں اس گائیڈ بک کے صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اگرچہ اردو میں ان خاص مقامات وعلامات کی بازنگاری ممکن نہ ہو سکی جن کی طرف اشارہ مہروں اور تعویزوں سے تعلق رکھنے والی تصریحات میں موجود ہے۔

تصاویر کے وسیلہ سے اس کتاب کی تاریخی حقیقت اور درجہ استناد کو باقی رکھنے اور مستند مواد تک پہنچنے کی جو فی الجملہ سعی کی گئی ہے وہ اردو میں اپنی نوعیت کی شاید پہلی مثال ہے۔

خواجہ صاحب کو تاریخ سے جو خاص ذہنی لگاؤ رہا اور اس کی پیش کش سے جو علمی اور ادبی دلچسپی ان کے یہاں دیکھنے میں آتی ہے، اس کا اندازہ بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے، مٹکاف کی ڈائری کے ترجمہ اور مرقع دہلی کی تلخیص سے بھی ہوتا ہے مگر اس سے بھی کچھ زیادہ خواجہ صاحب کے سفر نامے اور ان میں شامل

تصویریں، مرقع، خاکے اور نقشہ اس رجحان کی نمایاں مثال پیش کرتے ہیں۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسی نوعیت کی دوسرے مصنفین کی کتابوں میں یہ مواد اسی نسبت سے کم یاب ہے۔

ممکن ہے، تصاویر اور مجسموں کے عکس یا انسانی شبیہوں کو شامل کرنے میں بہت سے مسلمان مصنفین کے مذہبی عقائد کو بھی دخل رہا ہو۔ خود خواجہ صاحب بھی ایک مذہبی آدمی تھے مگر ان کا نقطۂ نظر دوسرا تھا شبیہ داری اور تصویر کشی کے بارے میں انھوں نے اپنے زاویۂ نگاہ کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"قرآن مجید میں گانے بجانے اور تصویروں کے خلاف کوئی حکم مخالفت کا نہیں ہے۔۔۔ رسولِ خدا نے اپنے وقت کے لوگوں کو بت پرستی سے بچانے کے لیے تصویروں کی مخالفت کی تھی۔ بعد کے مسلمانوں نے اس وقتی حکم کو ہمیشہ کے لیے سمجھ لیا۔ اگر یہ حکم ہمیشہ کے لئے ہوتا تو قرآن میں اللہ تعالیٰ تصویروں کے خلاف کوئی نہ کوئی حکم ضرور ارشاد فرماتا۔۔۔۔ اس واسطے سمجھنا چاہیے کہ اسلام علوم و فنون کا مخالف نہیں ہے۔"

جس کے یہ معنی ہیں کہ علمی نقطۂ نظر سے خواجہ صاحب کے نزدیک تصویر کشی یا تاریخی مجسموں کے عکس کی پیش کش کا معاملہ شرعی ممانعت کے حکم میں نہیں آتا۔ یہ کوئی فتویٰ نہیں ہے لیکن اس علمی زاویۂ نگاہ پر غور و فکر کی گنجائش سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کتاب کا نام اگر تاریخ فراعنہ ہوتا جو خواجہ صاحب کے بھی پیشِ نظر رہا تو شاید زیادہ بہتر تھا۔ فرعونی تاریخ سے اس کا مفہوم کچھ بدل گیا ہے اور اس میں ایک گونہ مذہبی نفسیات کا رنگ جھلکنے لگا ہے لیکن کتاب کی تحریر اور اس کے تاریخی حقائق تک رسائی کی کوشش کے سلسلہ میں خواجہ صاحب نے کسی جذباتی رویہ سے کام نہیں لیا اور نصیحت و عبرت سے بھی اس کے صفحات کو آزاد رکھا جو ان کے مورخانہ رویہ کی غیر جانب داری کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔

بحیثیت مصنف ان کے رویہ میں تاریخ نگاری کا جو ایک نمایاں بلکہ ناقابلِ انکار پہلو ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ماخذ کا حوالہ پوری احتیاط کے ساتھ درج نہیں کیا اور ( )

ایک شکایت یہ بھی ہے کہ کتاب کے صفحات میں تفصیل بہت کم ہے، اس سے اجتناب یا دانستہ صرفِ نظر کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کتاب کی تیاری ایک طویل مدت میں عمل میں آئی تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۴۴ء تک مزید ایک ثلث صدی گذر چکی تھی، یعنی تین دہائیاں

اور کم و بیش تین اکائیاں اس کے آغاز تصنیف میں بیت رہی تھیں اور تمام حوالے مستحضر نہ تھے۔ علاوہ بریں یہ زمانہ بھی ان کی صحت بالخصوص ضعف بینائی کے لحاظ سے اس کام کے لیے سازگار نہ تھا۔ خواجہ صاحب اس وقت اپنی بصارت سے نہیں صرف بصیرت ہی سے کام لے سکتے تھے۔ اور ان کے لیے اپنے دست و قلم سے لکھنے کے بجائے صرف لکھوانا ہی ممکن تھا۔ ان کے چند احباب یا پھر معتقدین نے ان سے اس کتاب کے مضامین کے لیے عربی و انگریزی زبان سے ترجمہ و تلخیص وغیرہ کے سلسلہ میں قلمی تعاون کیا۔ خواجہ صاحب کی صراحت کے مطابق انھوں نے یہ خود خواہش کی کہ ان کا نام بحیثیت مترجم یا قلمی معاون کے دینا چاہیے۔ خواجہ صاحب نے ان کا حق المحنت ادا کر دیا۔ یہ اس وقت ہو جاتا تھا اور آج بھی ہوتا ہے مگر اس سے علمی تحقیق کے کام میں بہت سی دشواریاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔

ممکن ہے حسین نظامی صاحب نے اس کام کی انجام دہی میں، خواجہ صاحب کی بطور خاص مدد کی ہو کہ خواجہ صاحب اُن سے تاریخ نگاری کا کام لینا بھی چاہتے تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے:

۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء میں .... میں نے اردو انسائیکلو پیڈیا تیار کرنے کا ارادہ کیا اور تجویز کی کہ ایک ہزار جلدیں اس کتاب کی شائع کی جائیں۔ ہر جلد میں چار سو صفحات ہوں اور مضامین منتخب کر کے، ہندوستان کے ان اشخاص میں تصنیف و تالیف کے لئے تقسیم کر دیے جائیں جو اس فن کے عالم اور اس مضمون کی مہارت رکھتے ہوں۔ ...... میں نے اپنی ذات کے لئے اور اپنے بڑے لڑکے حسین نظامی کے لئے فن تاریخ کو نامزد کیا اور اس سلسلہ کا کام شروع کر دیا گیا۔

بن نظامی صاحب کے خصوصی تعاون کی طرف اس کتاب کے طرزِ گذارش سے بھی ذہن منتقل ہوتا ہے اور یباچے سے بھی جس میں خواجہ صاحب کا نام اس طور پر آیا ہے جیسے کوئی دوسرا ان کے بارے میں لکھ رہا ہو اور وہ خود اپنے قلم سے نہ لکھ رہے ہوں جبکہ دیباچہ کے آخر میں دستخط انہیں کے ہیں۔

اس کتاب کا یہ نگارشہ بھی قابلِ توجہ ہے:

"میں چھ مہینے تک لگاتار آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا رہا لیکن میرے نحو بری کام میں کوئی فرق نہیں پڑا اور یہ تاریخ میں نے اسی زمانہ میں لکھوائی۔ اس کام میں جن اصحاب نے

امداد دی ہے وہ نہیں چاہتے کہ اُن کا نام ظاہر کیا جائے۔ تاہم میں نے اُن کا حقِ محنت ادا کر دیا ہے اور جو واقعات عربی تاریخوں سے ترجمہ کر کے مجھے دیے گئے تھے اُن کی ترتیب میں نے اور میرے لڑکے حسین نظامی نے کی ہے۔ (۳)

اگر یہ ادھوری سچائیاں اپنی صحیح حدود کے ساتھ سامنے آجاتیں تو اس اہم تاریخی کتاب کی استنادی حیثیت بہت بڑھ جاتی۔ اس کے ماخذ کے بارے میں لکھا گیا ہے:

"یہ کتاب پُرانی اور نئی مستند کتابوں کی مدد سے تیار کی گئی ہے جن کی فہرست کسی دوسری جگہ آپ ملاحظہ کریں گے۔"

کاش اس اہم کتاب کے ساتھ یہ فروگذشت نہ ہوتی جس کی اشاعت اُس کے مسودہ کی تیاری کے بعد مزید دو سال تک کاغذ کی نایابی کی وجہ سے ملتوی بھی رہی اور فہرست اصل کتاب کے ساتھ شامل ہوتی۔

خواجہ صاحب اس کے بعد تاریخ نمرود بھی مرتب کرنا چاہتے تھے جس کے لیے لکھا گیا ہے کہ تاریخ لکھنے کا کام شروع کر دیا گیا۔ ممکن ہے وہ اس موقعہ پر اُسے دینا چاہتے ہوں۔

ازمنۂ قدیم اور ملل ماضیہ کی تاریخ سے خواجہ صاحب کی خصوصی دلچسپی کا سبب ہندوستان کی تہذیب و تاریخ سے ان کا وہ ذہنی اور جذباتی رشتہ ہے جو قرنوں اور صدیوں پر نہیں، ہزاروں ماہ و سال پر پھیلا ہوا ہے۔

خواجہ صاحب ہندوستان کی صبح آزادی کو طلوع ہوتے ہوتے دیکھ رہے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ اپنے ماضی کی بازیافت اور اپنی تہذیبی شناخت کے لئے اپنی تاریخ کے ان ادوار اور ان سلسلوں پر نظر رکھیں جو ہندوستان کی مخصوص جغرافیائی حدود سے باہر شام و روم اور مصر و عراق تک پھیلے ہوتے ہیں۔ دیباچہ میں لکھا ہے:

"خواجہ حسن نظامی کے سفر نامہ مصر و شام و حجاز اور سفر نامۂ افغانستان کی بعض تصویریں بھی اسی غرض سے فرعونی تاریخ میں شریک کی گئی ہیں کہ ناظرین کو اندازہ ہو جائے کہ فلسطین اور شام اور مصر اور افغانستان اور بابل و نینوا کے پرانے تمدن اور ہندوستان کے پرانے تمدن کی یکسانیت اور مشابہت پر غور کیا جائے تاکہ ہندوستان واقف ہو کہ اُس کی تہذیب، اس کا تمدن اور

اس کا کلچر اور اس کی سرحدیں بہت زیادہ وسیع ہیں اور جب کبھی ہندوستان آزاد ہو تو وہ عراق اور مصر اور فلسطین اور شام اور حجاز و ایران و افغانستان کو غیر نہ سمجھے اور ان سب ملکوں کو اپنے کلچر اور اپنی تہذیب اور اپنے تمدن اور اپنی تاریخ اور اپنی روایات کا شریکِ حال تصور کرے اور ہندوستانی قومیت اپنی عظمت اور اپنی وسعت سے آگاہ ہو اور اس کے بعد یہ سوچے کہ کیونکہ کروہ سب ملک ایک قومیت کے مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں جن کی زبانیں آپس میں مشابہ ہیں اور جن کی تہذیب اور تمدن اور کلچر، اور خیالات اور معاشرت میں بھی ہزاروں برس سے مشابہت چلی آتی ہے۔ (۳)

اس سے خواجہ صاحب کے تمدنی زاویۂ نگاہ اور افریشیائی معاشرت و تہذیب کے گہرے رشتوں پر ان کی عکس ریز نظر کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی کہ یہ بات اس زمانہ میں کہی جا رہی ہے جب آزادی سے پہلے ہندوستانی سیاست بے طرح فرقہ وارانہ حلقوں اور طبقہ دارانہ وفاداریوں میں بٹی ہوئی ہے۔

اپنے اس مختصر دیباچہ میں انہوں نے اپنے عہد کی مغربی سیاست اور اس کے فریب کارانہ طریقِ عمل کی بھی نشان دہی کی ہے اور یہ اس کے باوجود ہے کہ وہ اس وقت کے انگریز آفیسروں کے دوست ہیں۔ لکھا ہے:

> ہندوستان کے ہندو مسلمان۔ یورپ اور امریکہ کی غرض آلود تحریروں و تقریروں کے زیرِ اثر آگئے ہیں اور اپنی پرانی تاریخ اور پرانی تہذیب اور پرانے کلچر کو بھولتے جا رہے ہیں۔ جب وہ یہ پرانی تصویر دیکھیں گے تو ان کو یورپ اور امریکہ کی سیاسی مصلحتیں معلوم ہو جائیں گی اور وہ ان کی خود غرضانہ چال بازیوں سے ہوشیار ہو جائیں گے۔ (۴)

کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول مصر کے بادشاہوں سے متعلق ہے۔ دوسرے اور تیسرے کے بارے میں جن کی سرخیاں نہیں دی گئیں، خود فرہنگ میں یہ وضاحت موجود ہے کہ کاتب نے سرخیاں نہیں لکھیں۔ چوتھا باب مصریوں کے تمدن سے تعلق رکھتا ہے۔ پانچواں باب ان کی علمی اور ادبی زندگی سے متعلق ہے۔ چھٹے باب میں مصری آرٹ پر گفتگو کی گئی ہے۔ ساتویں باب میں مصر کی دست کاریوں کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ آٹھواں باب مصری فنِ تعمیر سے تعلق رکھتا ہے۔ نویں باب کا موضوع فرعونوں کی لاشیں ہیں اور دسویں باب میں مصر کے عجائب گھر کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ان ابوابِ عشرہ میں مصر کی تاریخ اور تمدن کے بیشتر پہلو زیرِ بحث و نظر آگئے ہیں اور اس وقت گیا، اس وقت تک بھی قدیم ملک، اس کی عظیم

تاریخ اور عجیب و غریب تمدنی پیش رفت پر شاید ہی ایسی کوئی دوسری کتاب ان تفصیلات کے ساتھ سامنے آئی ہو۔

اس میں مختلف زمانوں کے شاہی خاندانوں اور ان کے حکمراں کے تذکرے ہیں، سو وہ سبھی فرعون کہلاتے تھے۔ ادوار بہ ادوار تاریخی حالات و واقعات کا جو ذکر کیا گیا ہے نیز اس گفتگو میں مصر کی تہذیب و معاشرت اور صنعت و حرفت کے مختلف پہلوؤں پر جو تاریخی مواد جمع کیا گیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صاحب کے نزدیک تاریخ صرف بادشاہوں کے ذکر و اذکار اور ان کی فتوحات و مہمات کے تعارف نامہ کا نام نہیں بلکہ اس دورِ زندگی کی مکمل اور مربوط تصویر کا نام ہے جس کے دھنک انگ دائرے میں قلعوں سے لے کر جھونپڑوں تک اور دربار و خانقاہ سے لے کر گلیوں اور بازاروں تک زندگی کا تمام تحرک دتصور سمٹ آتا ہے۔

اختر الواسع

خواجہ حسن نظامیؒ کی دُعائیں

ایک نئی جہت

دُنیا کے ہر مذہب میں 'دُعا' کی روایت اس کے آغاز سے چلی آ رہی ہے۔ اہلِ دل نے دُعا کو مذہبی زندگی کی رُوح قرار دیا ہے اور اصحابِ ظاہر کے نزدیک بھی مذہب کی عملی شکل کا اظہار و انحصار بڑی حد تک دُعا پر ہے۔ دُعا کے ذریعہ گوہرِ مقصود کو پانا اور خود انبیاء و مرسلین کا اپنے رَب سے دُعا مانگنا اور ان کا قبول ہونا قرآنِ مجید میں مذکور ہے۔

دُعا پُکارنے کو کہتے ہیں اور اسلامی اصطلاح میں دُعا سے مُراد وہ پُکار ہے جو بندہ اپنے رَب کے حضور بلند کرتا ہے۔ دُعا کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے انسان فطرتاً فقیر و محتاج ہے، جبکہ ذاتِ باری تعالیٰ غنی و بے نیاز اور اس فقر و محتاجی ہی کی وجہ سے انسان دُعا کے لئے مجبور ہے۔ سورۂ مومن میں ارشادِ ربانی ہے کہ "مجھ سے دُعا کرو، مَیں تمہاری دُعا قبول کروں گا۔" پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "دُعا مومن کا ہتھیار، دین کا ستون اور آسمان و زمین کا نور ہے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "دُعا عبادت بھی ہے اور عبادت کا مغز بھی۔"

صُوفیائے کرام کے یہاں دُعا ایک مُستقل 'انسٹی ٹیوشن' کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ان کے حضور اور غیاب میں ان کے توسط اور توسل سے دُعا کا چلن عام رہا ہے۔ حضرت خواجہ حسن

نظامیؒ خود صُوفی تھے، اس لئے ان کے یہاں بھی دُعا کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ اتفاق بھی کم دِلچسپ نہیں کہ ان کے عہدِ طفلی کی سب سے پہلی تحریر "مفلسی کا مجرّب علاج بذریعہ دُعا" نامی رسالہ ہے جو غالباً ۱۹۰۰ء میں پہلی بار شائع ہوا اور ۱۹۲۵ء تک اس کے دس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ اس میں مولانا جلال الدین السیوطیؒ کے عربی رسالہ "حصول الرفق بوصول الرزق" کا اُردو ترجمہ ہے اور اس پر خواجہ صاحبؒ نے حواشی بھی لِکھے ہیں۔ یہ ان دُعاؤں کا مجموعہ ہے جو "رزق کی تنگی" اور "معاش کی عسرت" کو دُور کر سکیں۔ اس کے علاوہ خواجہ صاحبؒ نے "اُردو دُعائیں" کے نام سے بھی ایک رسالہ مرتب کیا جس میں "اللہ تعالیٰ سے ہر مُراد اُردو زبان میں مانگی گئی ہے۔" اس رسالہ میں "صحیح حدیثوں میں آئی ہوئی عربی دُعائیں بھی" اُردو میں جمع کر دی گئی ہیں۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں خواجہ صاحبؒ کی شخصیت بڑی رَنگا رَنگ، ہمہ جہت اور مرتب و متوازن تھی۔ ان کی ذات کے جلوۂ صد رنگ سے مذہب، تصوّف، ادب، معاشرت، سیاست و صحافت اور تجارت و سیاحت کی ہر انجمن میں روشنی رہی۔ انہوں نے اپنے 'افکارِ تازہ' سے ہمارے ادب میں نہ جانے کتنے 'جہانِ تازہ' آباد کیے۔ انہوں نے تخیل اور تصوّر کی گلکاری سے قوس و قزح کی سی دِلکشی و دِلاویزی اپنی تحریروں میں پیدا کر دی۔ انہوں نے بھاری بھرکم اور ادق فلسفیانہ مسائل کو اپنے جذبات کی شدت سے اس طرح موم کیا کہ عوام و خواص سب کی رُوح کو گرمایا اور دِل کو تڑپایا۔

جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا ہے خواجہ صاحبؒ، کثیر الاوصاف شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مُرید بھی تھے اور مُراد بھی، صُوفی بھی تھے اور صحافی بھی، دین دار بھی تھے اور دُنیا دار بھی، ادیب بھی تھے اور تاجر بھی، مقلّد بھی تھے اور غیر مقلّد بھی، وہ کٹّر مسلمان بھی تھے اور وسیع المشرب انسان بھی۔ وہ دُعاگو بھی تھے اور دُعاجو بھی۔ ان کی دُعاؤں میں جو دلسوزی اور حضوری کی کیفیت پائی جاتی ہے، اُردو میں اگر دُعائیہ لٹریچر کا کوئی باب ہوتا تو اس میں خاصے کی چیز مانی جاتی۔ ان کی دُعاؤں میں 'دردِ تنہا' کی نہیں بلکہ 'غمِ زمانہ' کی نمائندگی ہے۔ انفرادی دُعا میں بھی اجتماعی مفاد کا خیال غالب ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ان میں انسان

کی ضرورت مندی کے ساتھ ہی ساتھ عسری حسیت، تاریخی شعور، حب الوطنی، تلمیحات، مذہبی علامات اور دینی شعار سب کی بھرپور جھلک ملتی ہے۔

خواجہ صاحبؒ اپنے رَب کے ساتھ تعلق میں نہ تو حالیؔ کے پیرو ہیں کہ اُف بھی نہ کریں اور نہ اقبالؔ کے ہم مسلک کہ شکوہ و شکایت پر اُتر آئیں۔ قرآنِ مجید میں حکم ہے کہ دُعا میں عاجزی و انکساری سے کام لینا چاہئے اور اللہ کو اس کے اچھے ناموں سے پُکارنا چاہئے۔ خواجہ صاحب اپنی دُعاؤں میں اس کا خیال کس حد تک رکھتے ہیں دیکھئے:

"بجلی میں چمکنے والے، چاند میں جھلکنے والے، رات کے اندھیرے، سُورج کی روشنی، آسمان کی بلندی، دریا کی روانی، جنگل کی سنسانی، دلگیری و دلداری کے مالک! عرش کی اقامت میں جدا، دل کے گھرانے میں خُدا! ہم تیرے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اگر تو عرش پر ہے ہم کو سر بلند کر، فرش میں ہے تو وسعت و ثابت قدمی عنایت فرما، دل میں ٹھکانا ہو تو اس کو اپنے رہنے کے قابل بنا دے، رگِ جان میں ہو تو خون میں اپنی شان اور آن بان کا جوش پیدا کر، اگر تُو ہر جگہ ہے تو ہم کو بھی ہر جگہ پہنچا دے۔"

خواجہ صاحبؒ، انسان کے مرتبہ اور اس کی حیثیت کا عرفان رکھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ یہ اشرف المخلوقات زمین پر خدا کا نائب ہے۔ ایک نائب کی حیثیت سے اپنے آقا کے حضور اپنی عرضی اس طرح گذارتے ہیں کہ اس کی شانِ ربوبیت اور ان کے اظہارِ عبودیت دونوں کو سزاوار ہو۔ دُعا کے پیرایہ میں 'اِیّاکَ نعبدُ و ایّاکَ نستعین' کی تفصیل دیکھئے:

"تُو عالم ہے، اپنے علم کا حصّہ ہم کو بھی دے۔ رازق ہے، ہمارے ہاتھوں سے رزق بانٹ۔ رحمٰن ہے، رحمت نازل فرما۔ قہر و جبر کی تلوار ہمارے دُشمنوں کے ہاتھ میں نہ دے۔ خیر کو وسعت دے کر شر سے بچا۔ ہماری آنکھ بن، تجھ سے دیکھیں۔ کان بن، تجھ سے سُنیں۔ زبان میں تو ہی بول، ہاتھ سے تُو ہی کام کر۔ تو بعید ہے تو قریب آجا، قریب ہے تو اقرب ہو جا۔ اقرب ہے تو نحن اقرب کا حجاب بھی اُٹھا دے۔"

تصوف میں عشقِ الٰہی کو محور کی حیثیت حاصل ہے اور عشق کیا ہے؟ حالتِ عشق

میں کیفیت اضطراب۔ برہا میں دیاکل ہونے کو ہی تو عشق کہتے ہیں۔ جب آرزوئے وصال اور دید کی تمنا ہی متاعِ حیات بن جائے تو اس کو معراجِ عشق کا درجہ دیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحبؒ کی دُعاؤں میں اس رنگ کو بھی دیکھئے:

"آ ـــــ خوشی بن کر آ، غم میں سما کر آ، مگر آ۔ عید کے چاند میں آ، مُحرم کے ہلال میں نظر آ، چمک میں، جھلک میں، تاریکی میں لہریں لے کر، کڑک کے دِل ہلا، لیکن اے آنے کے قابل آ ـــــ کہتے ہیں تُو ہر چیز میں آسکتا ہے۔ ہر حال میں تیری آمد کا امکان ہے۔ تیرے آنے میں دیر نہیں لگتی۔ تجھ کو بُلانے کی ضرورت نہیں۔ آئے بغیر جو آجائے، بلا حرکت متحرک ہو۔ وہ تُو ہے۔ تُو بس اسی طلسماتی، غیر مفہوم چال سے آجا۔ دیکھ آجا، سُن آجا، سمجھ آجا۔ ہم کو وہ دیدار دے جو دیدۂ دیدار طلب کے شایاں ہو۔ موسیٰ کو بے ہوش کرنے والا، طور کو خاکِ سیاہ بنانے والا نہیں"۔

برہا کی رت میں بیاکل من کی بِنتی دیکھئے اور ساتھ ہی ساتھ گنگا جمنی زبان کا چٹخارہ بھی لیجئے:

"داتا تُو کہاں ہے؟ مَن کی بپتا کے دیکھن ہار، مولیٰ، مولیٰ، سُن اُلجھنوں میں ہوں، گردشوں میں ہوں۔ بے قراری دیکھ، آہ وزاری دیکھ، اشکباری بھی . . . . . یہ رات کیوں کر کٹے۔ تو یاد آتا ہے۔ کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ اپنے داس کو درشن دے، رُوپ دِکھا۔ جلوہ افروز ہو۔ آنکھ بے ہوش اور مَن سنتوش ہو۔ کس کا بلقان، کیسا ایران، تیری رحمت کا چشمہ اور اس میں اشنان، اسی میں ہیں دونوں جہان۔ رین اندھیری، بدلی کالی، رستہ بھاری، دُشمن سر بر، غفلت دِل میں، ہاتھ پکڑ بھگوان . . . . .

. . . . . سر ہے حاضر، کھینچے کٹاری، عشق کی اگنی چِتا ہماری، ست پکاریں ست بن جائیں، جزو کو تیاگیں، کُل ہو جائیں، یثرب پہنچیں، مکّہ دیکھیں، بیچ سمند رجھنڈا گاڑیں، . . . . . تو ہو بس میں، سب ہوں بس میں،

حسن نظامی کس کا بندہ؟ وقت کٹھن ہے، اُلکا پھندہ۔ بھگتی اپنی من کو دے، بھارت سیوا سب کو دے، بس میں آ بھگوان، تیرے نام کو پرنام یا ذی العزۃ والجبروت و الاکرام۔"

بیت المقدس کے سفر کے موقعہ پر ۶ رجولائی ۱۹۱۱ء کو خواجہ صاحبؒ نے حضرت زکریاؑ کی محراب میں حاضری کے وقت جو دُعا مانگی، اس کا ایک اقتباس دیکھئے:

"زکریاؑ کے رَب! اپنے بندے کی ندا کو رحمت سے سُننے والے خُدا! جب زکریاؑ نے اس محراب میں بیٹھ کر تجھ سے کچھ مانگا تو تیرے قول کے موافق چپکے سے مانگا جس کو تُونے سُن لیا اور زکریاؑ کے دامنِ مُراد کو گوہرِ مقصود سے بھر دیا۔ بتا کر میں ندائے خفی سے پُکاروں یا صدائے جہر لگاؤں۔ زکریاؑ عُمر میں بوڑھے تھے اور میں قویٰ کے اعتبار سے ضعیف۔ زکریاؑ کو اپنی بیوی کے بانجھ ہونے کی شکایت تھی اور مجھ کو اپنی قوم کے بانجھ ہونے کا شکوہ ہے۔ یعنی اس سے نمو کی صفت مفقود ہو گئی ہے۔"

دُعاؤں کی صورت میں گداز قلب کی دولت بیدار کے یہ تو چند نمونے تھے جو یہاں پیش کئے گئے، ورنہ 'سی پارۂ دل' میں تو پہلی منزل ہی عبد و معبود کے راز و نیاز کی ہے۔ جس میں حروف کی دُعائیں بھی ہیں اور موسمی دُعائیں بھی۔ آنسو بھری آنکھ کی التجا بھی ہے اور بندوں کی دُعا بھی۔ جس میں تمام دنیوی و دینی حاجات کے رَبّ العالمین کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں خواجہ صاحبؒ کے تصورِ دُعا کے بارے میں ایک حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ان کا حرکت میں برکت پر ایمانِ راسخ تھا اس لئے وہ دُعائے محض کے قائل نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"آج کل اکثر مُسلمان کاہل وجود ہو گئے ہیں۔ ان سے محنت اور کوشش نہیں ہو سکتی اور محض یہی دُعائیں پڑھ کر انتظار کرنے لگتے ہیں کہ غیب سے رزق آجائے گا اور خزانۂ الٰہی سے دولت برسنے لگے گی۔ حالانکہ ان دُعاؤں کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان ظاہری محنت اور کوشش

بھی کرے اور یہ دُعائیں پڑھ کر پروردِگار کی امداد و برکت بھی چاہے۔ محض اس بھروسہ پر نہ بیٹھا رہے کہ ان دُعاؤں کی برکت سے ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر روپیہ آجائے گا، قرضہ اُتر جائے گا اور مفلسی دُور ہو جائے گی۔

مَیں اس قسم کے نکمے، سُست اور بیکار مفلسوں سے تنگ آگیا ہوں جو رات دن صرف وظیفے پڑھتے رہتے ہیں۔ اور حلال روزی کمانے کے لئے ہاتھ پاؤں سے محنت نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لیس الانسان الا ما سعیٰ انسان کو اس عالمِ اسباب دُنیا میں کوشش کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔"

سوہن لال بھٹناگر

مصور فطرت شمس العلماء خواجہ حسن نظامی دہلوی

شخصیت اور کارنامے

غیر معمولی شخصیتیں علوم عقلی کی مانند، زبان اور ملکی حدود سے بالاتر ہو جاتی ہیں محترم خواجہ حسن نظامی صاحب رح کی شخصیت اور ان کے علمی و ادبی کارنامے ہندوستان سے باہر دنیا کے دور دراز حصوں تک پہنچ کر شہرت دوام پا چکے ہیں۔ پنسلوانیا، امریکہ میں کسی دعوت میں ایک اورنٹیل سکالر سے میری بات حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب رح کی شخصیت اور اُن کے ادبی مقام پر ہو رہی تھی۔ اس عالم کا یہ کہنا تھا کہ اگر خواجہ صاحب یورپ یا امریکہ میں پیدا ہوئے ہوتے تو نہ صرف بیسویں صدی بلکہ آنے والی کئی صدیوں کے گنے چنے اصحابِ علم و فن میں ان کا شمار ہوتا۔ میں نے خواجہ صاحب کا یکتائے روزگار "منادی" کوئی پچاس برس پہلے پڑھنا شروع کیا تھا۔ میرے علم میں تمام دنیا میں یہ دوسرا میگزین اپنی نرالی نوعیت کا ہے۔ علاوہ ازیں انگلستان میں ایک صاحب کا ایک بہت مقبول جریدہ بھی صرف اپنی ذاتی ڈائری پر مشتمل ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب کی تحریریں اُردو کے وسیع و عریض خطہ میں ایک گلستانِ شادمان کی طرح بقائے دوام حاصل کر چکی ہیں۔ آپ کی تحریر کا موضوع کیسا بھی دقیق ہو اس میں ایک منفرد رنگ و بو ہے۔ فلسفہ، تصوف تفسیر قرآن مجید، سفر نامہ مشرق وسطیٰ، مشاہداتِ زیارت بیت اللہ بڑے لوگوں سے ملاقاتیں روزمرہ کی مصروفیتیں سب کا تذکرہ ایسے دل نشیں پیرایہ میں ہے کہ اس کی

تازگی سالہا سال تک بار بار پڑھنے پر بھی کم نہیں ہوتی بلکہ قند مکرر کا لطف دیتی ہے۔

خواجہ صاحب کی تحریروں میں ایک دلکش تنوع موجود ہے۔ صوفیائے کرام کے لیے مسائل و مراحل و منازلِ تصوف روح کی بلندیوں کو چھو لینے کے انداز میں بیان کیے ہیں۔ جن اصحاب نے خواجہ صاحب کی تصنیف سی پارۂ دل اور تفسیر قرآن مجید مطالعہ کی ہیں۔ وہ اس کی تائید کریں گے۔ میں دنیا میں گھومتا رہتا ہوں۔ ابھی فرانس میں ایک صاحب خواجہ صاحب کی تحریروں کے شیدا ملے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ میں اُن کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور ان کے مکان کے نزدیک ہی رہتا ہوں تو فرطِ اشتیاق سے مجھے گلے لگایا۔ میری دانست میں نہ صرف اُردو ادب بلکہ تاریخِ ہند پر بھی خواجہ صاحب کا زبردست احسان ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے متعلق ان کی کتابیں (Classics) کا درجہ رکھتی ہیں۔ تاریخِ ہند کے اُن المناک ایام کی جو لفظی تصاویر خواجہ صاحب نے کھینچی ہیں ان کی مثال تاریخی ادب میں کہیں نہیں ملے گی۔ انگریزی حکومت کی جانب سے شمس العلماء کا بلند ترین اعزاز بھی ان کے قلم کی کاٹ کو کُند نہیں کر پایا اور آپ نے پوری بے باکی سے اُس دَور کے انگریزی مظالم کی روداد لکھی۔ ابھی میں کوئی چالیس برس پہلے کے مُنادی کی کاپیوں کی ورق گردانی کر رہا تھا تو اس میں جا بجا دہلی کے انگریزی انتظامیہ پر کڑی نکتہ چینی دیکھی۔ یہ آپ کی روحانی بے تعلقی اور بے مثال اخلاقی جرأت کی عکاسی کرتا ہے۔

آپ کی منصف مزاجی اور مذہبی رواداری کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جہاں آپ نے اسلام کی فضیلت پر بہت کچھ لکھا۔ وہاں ۱۹۱۷ء میں بھگوان کرشن پر ایک معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی۔ اس کا نام "کرشن بیتی" ہے اور اس میں کرشن جی سے متعلق غلط العام روایتوں کی پُر زور تردید کی گئی ہے۔

خواجہ صاحب کی شخصیت باغ و بہار تھی۔ آپ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین کے خواہر زادگان عالی مقام میں سے تھے۔ طریقت اور معرفت کی منزلیں طے کرتے تھے لیکن مزاج میں خوش طبعی تھی۔ دین و دنیا کے بار خوش اسلوبی سے اُٹھاتے تھے۔ ہلکے پھلکے مزاح کے زعفرانی چھینٹے بھی مار جاتے تھے۔ ملاحظہ ہو حیدر آباد کے سفر کو تشریف لے جا رہے ہیں۔ رستہ میں ان کے درجہ میں

ایک یونانی آتے ہیں جو کسی تمباکو کمپنی کے افسران میں ہیں آپ سگریٹ پر اتنی مفصل واقفیت اس یونانی کو دیتے ہیں کہ وہ بے اختیار پوچھتا ہے کہ جناب کیا آپ بھی سگریٹ کے کارخانہ کے مالک ہیں تو خواجہ صاحب جواب دیتے ہیں کہ بھئی میں تو خود ہی ایسا سگریٹ ہوں جو ہمیشہ جلتا رہتا ہے۔

آپ کی قیام گاہ مرجع خاص و عام تھی جہاں آپ کی روحانی، تاریخی، ادبی شخصیت کی پُرزور مقناطیسیت سے دنیا کے دُور دراز حصوں سے یورپی امریکن ایشیائی افریقی معتقدین کھنچے آتے۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی وزراء، روساء، حکام، علماء، عوام بھی اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے۔ آپ کا سلوک ہر کسی سے مشفقانہ ہوتا۔ آپ کا روزنامچہ ایک ایسا وسیع سٹیج ہے جس پر نواب، راجے، مہاراجے، انگریز وائسرائے، سیاسی لیڈر، درویش، پیر فقیر، اخبار نویس، تاجر، امراء، غرباء آجا رہے ہیں اور مرکز میں خواجہ صاحب رونق افروز ہیں۔ اُن کے روزنامچہ میں جہاں وہ والیانِ ریاست، راجاؤں، نوابوں سے اپنی درویشانہ ملاقاتوں کا حال شانِ بے نیازی سے بیان کرتے ہیں۔ وہاں ملنے والے غرباء کے مسائل کا تذکرہ بھی لکھتے ہیں۔

خواجہ صاحب دہلی کی قدیم تہذیب کا مرقع تھے۔ آپ اردو انشاء کے جرے سہ رکھی تھے اور دہلی کی ٹکسالی اردو بھی اس خوش بیانی سے بولتے تھے کہ الفاظ مدتوں کان میں گونجتے رہتے۔ آپ صادق القلب قوم پرست اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ دست بکار و دل بیار کے مصداق آپ عشقِ حقیقی میں غرق رہتے تھے۔ میرے والد اور میں ایک بار خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھے تو آپ نے یہ شعر اس طرح ادا کیا کہ دل میں اُتر گیا۔

عشق را با مومن و کافر نباشد احتیاج
ایں سخن بر مسجد و بت خانہ می باید نوشت

شمس العلماء مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

اپنی تحریروں کے آئینے میں

"تم پر کیا بیتی؟ اس کوڑے میں آنے کی کیا افتاد پڑی؟ گدڑی بولی: میرے جسم میں چار رنگ کے کپڑے ہیں۔ جن کو ایک بھکاری فقیر نے جوڑا تھا۔ ایک دُلاری طوائف کا پارچہ پشواز ہے۔ دوسرا مولانا نجم الحق کی عبا کا حصہ ہے۔ تیسرا پنڈت ہرنام داس کی پوتھی کا جزدان ہے۔ چوتھا مسٹر ڈگلس کی قمیص کا ٹکڑا ہے۔

"یہ چاروں اپنے اپنے وقت میں ذی مرتبہ تھے۔ دلاری طوائف کی پشواز عیش پرستوں کو عزیز تھی۔ مولانا نجم الحق کا جبّہ خدا پرستوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ پنڈت ہرنام داس کی پوتھی کا جزدان تمام پنڈتوں کا دین و ایمان تھا۔ مسٹر ڈگلس کی قمیص سینۂ حکمرانی کی ہم جلیس تھی۔

"مگر افتادِ ایام نے ان چاروں کو اپنے مالکوں کی نظر سے اتارا۔ کوڑی پر مدتوں ڈلوایا۔ پھر بھکاری کے ہاتھوں میں پہنچایا۔ اس نے سب کو جوڑ کر ایک گدڑی بنائی اور لباسِ غربت کی عزت دلوائی۔ اب بیچارہ فقیر بھی خدا کے ہاں گیا۔ بارہ برس کے بعد دن پھرے ہیں۔ یہاں آئی ہوں۔ سلوک کے مقامات طے کر کے میں بھی کاغذ بنوں گی اور انسان کو بتاؤں گی کہ عصبیت قلبِ ماہیت سے دُور ہو سکتی ہے۔"

اقتباس ــــ "تنکے کا سلوک" از رسالہ نظام المشائخ ۱۹۱۵ء۔ لکھنے والے:

"خواجہ حسن نظامی — پیدائشی نام: علی حسن۔ پیشہ قلم کاری، عمر ۳۰ سال۔
بچپن غم آلود، جوانی بے سود، بڑھاپا خوش حال و خوش خیال۔ طلوعِ آفتاب سے
پہلے قسمت روشن رہے گی۔ طلوع کے بعد روشنی ترقی کرے گی۔ زوالِ آفتاب
سے غروبِ آفتاب تک سرنگوں رہے گی۔ غروب کے بعد پہلا گھنٹہ اچھا رہے گا۔ اس
کے بعد زوال شروع ہوگا جو رات کے تین بجے تک رہے گا۔"

مضمون کے اقتباس کے بعد آپ نے جو کچھ پڑھا، وہ کسی نجومی کی پیش گوئی نہیں تھی بلکہ وہ حال تھا جو کسی خاص موڈ میں حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے ایک پرچے پر لکھا اور پھر اس پرچے کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے انھوں نے اپنی قسمت کو روشن بتایا ہے۔ یہ ان کی عبادت اور کام کا وقت تھا۔ جس کا سلسلہ دوپہر تک جاری رہتا تھا۔ دوپہر کے بعد کسی قدر آرام اور ملنے جلنے کا وقت تھا۔ اس کو انھوں نے زوال سے تعبیر کیا۔ مغرب کے بعد پھر ان کے لکھنے پڑھنے کا وقت تھا۔ اس لیے اس کو بھی اچھا بتایا۔ اور رات کی نیند کے وقت کو تو سراسر زوال سمجھا۔

حضرت خواجہ صاحب، دست بہ کار۔ دل بہ یار کی زندہ مثال تھے۔ محنت اور حلال روزی ان کے نزدیک نئے زمانے کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ اپنی آپ بیتی میں انھوں نے لکھا ہے:

"حسن نظامی نے اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دے لیا اور وہ یہ تھا
کہ اسلامی تصوف کو نئے انداز اور جدید طرز میں لکھا جائے، کہا جائے، برتا جائے"

اس مقصد کے حصول میں محنت اور حلال روزی کو سب سے اہم وہ یوں سمجھتے تھے کہ ان کے بزرگ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ نے روٹی کو اسلام کا چھٹا رکن بتایا تھا اور خواجہ صاحب کے نزدیک خانقاہوں کی ویرانی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اہلِ تصوف توکل کا غلط مطلب لینے لگے تھے اور انھوں نے اپنے آپ کو بے عمل اور نکما بنا لیا تھا۔ حضرت خواجہ صاحب کے اسی جذبے کی جھلک ان کے مشہور انشائیے "گلاب تمھارا کیکر ہمارا" میں اس طرح نظر آتی ہے۔

"ان سب شاعروں کو ہٹاؤ جو گلاب پر مرتے ہیں۔ سینکڑوں برس

سے ایک ہی چہرے کے طلب گار ہیں۔ یہ سب لکیر کے فقیر ہیں۔ سُنی سنائی تقلیدی باتوں پر جان دیتے ہیں . . . . ان لوگوں کو یہ نصیب نہ ہوا کہ جنگل میں نکل جاتے۔ خودرو پھولوں کو دیکھتے جن کا چمن صحرا ہے جن کی سیرابی قدرتی سیلابی ہے۔ ان میں ایک کیکر تھا۔ کیا چپ چاپ تھا۔ کیسا مضبوط اور توانا تھا۔ اس کی شاخیں دیکھی ہوتیں۔ اس کی پتیوں پر غور کیا ہوتا۔ گلاب کی ٹہنی میں کیا رکھا ہے۔ ایک کمزور لچکنے اور ٹوٹ جانے والی شاخ ہے۔ جس کو آجکل کے شہزور زمانے میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ وقت ان کی زندگی کا ہے جو حوادثِ ایام کا مقابلہ کر سکتے ہیں . . . . کیکر کی چھال مفید جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں اور مختلف رنگ تیار ہوتے ہیں۔ کیکر کی لکڑیاں جلنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں۔ کیکر کی پتیاں بکریاں کھاتی ہیں . . . . یہ میاں گلاب کس مرض کی دوا ہیں۔ پیٹ میں درد ہو تو گل قند کھلاؤ۔ ہیضہ ہو جائے تو گلاب پلاؤ۔ مرجاؤ تو قبر پر چڑھاؤ۔ اور بھی کوئی کام اس منحوس کے وجود سے نکلتا ہے؟ . . . . . . کیکر کا پھول گلاب کے پھول سے لاکھ درجے اچھا۔ گلاب کا پھول ایک دو دن کی تیز دھوپ میں کملا اور مرجھا جاتا ہے۔ اور کیکر کا پھول ہفتوں سورج کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور آج کل تعریف اسی کی ہے جو دشمن کے مقابلے میں زندہ سلامت رہے۔"

مضامین تصوف کو نئے انداز میں لکھنے، بیان کرنے اور برتنے کا جو عہد خواجہ صاحب نے کیا تھا اس کا حق بھی انھوں نے خوب ادا کیا۔ ان سے پہلے بھلا کب کسی نے دوا کی شیشی سے اس طرح باتیں کی ہوں گی۔ اور تصوف کی تلقین نے اس طرح کے الفاظ کا جامہ بھلا کب پہنا ہوگا:

"جب یہ شیشیاں گھر میں آئیں۔ کاغذی خرقہ سے برہنہ ہوئیں۔ واحدی صاحب نے بسترِ بیمار کے قریب لاکر رکھا۔ چاقو منگایا تاکہ بھید

کی مہر شیشی کے منہ سے تراشیں تو ایک صدائے سرمدی کان میں آئی پہلے مجھے دیکھو اور میری سُنو!

"کانچ کی معمولی شیشی ہوں۔ دیکھنے میں چھوٹا سا ظرف رکھتی ہوں۔ مگر انسان اشرف المخلوقات سے زیادہ صاحب تحمل و برداشت ہوں۔ اگر آدمی وہ سب دوا ایک ہی دفعہ پی جائے جو میرے اندر ہے تو مر جائے مگر میں خود زندہ ہوں اور دوسروں کی زندگی میرے ہاتھ میں ہے۔

"یہ تمھارے منہ پر مہر کیسی لگی ہے؟

"ہائیں! تم نہیں جانتے۔ باطنی تاثیر کے واسطے یہ لازمی ہے کہ سر بمہر ہو۔ درویش کے منہ پر سکوت کی مہر اسی غرض سے لگائی جاتی ہے کہ وہ امراض روحانی کی دوا ہے۔ مہر کھلی اور شیشی اعتبار و اعتماد سے گری۔

"اچھا تو کاغذی لباس تم کو کیوں پہنایا گیا ہے؟

"اس کا جواب بھی سن لو۔ الناس باللباس۔ آدمیت کی پہچان لباس سے ہوتی ہے۔ تو میں دائرہ شائستگی سے کس طرح باہر رہتی۔ خرقہ مکتوبی پہن کر نمودار ہوئی تب معلوم ہوا کہ میں کس مرض کی دوا ہوں!

"کیوں بی شیشی! تمھاری شکل تو گوری ہے۔ اگر تم کالی ہوتیں تو دوا کی تاثیر میں کچھ فرق پڑ جاتا یا نہیں؟

"واہ! کیا مجھ کو یوروپین خیال کر لیا۔ گو میری نمود یوروپ میں ہوئی لیکن میں اصل نسل مسلمان ہوں۔ اور اس پر صوفیانہ عقائد رکھنے والی میرے ہاں گورے کالے کی بحث گناہ ہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ باطن صاف ہونا چاہیئے۔ رنگ سفید ہو یا سیاہ۔ اگر میرا تن سیاہ ہوتا تو دوا کو کیا نقصان پہنچاتا۔ اصلیت ہم دونوں کی کانچ ہوتی ہے۔ دوا دونوں میں یکساں ہوتی ہے۔

"درویش کی مہر سکوت ٹوٹ جائے تو پھر وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔

تمہاری لالچی مہر دور ہو جائے تو بے کار ہو جاتی ہو یا نہیں؟

"میری مہر سکوت کھلتی ہے تو دوسروں کے فائدے کے لیے کھلتی ہے۔ ایسا ہی درویش اگر دوسروں کی فائدہ رسانی کی خاطر مہر سکوت توڑ ڈالے تو ہرج نہیں۔ بلکہ مہر لگتی اس واسطے ہے کہ کسی کے فائدے کے لیے ٹوٹے!"

ایک دوسرے مضمون "وحدت سردکام برف" میں فرماتے ہیں:

"جب تک پانی کے اندر نفسانی اور کثیف اجزاء شامل تھے۔ اس کے جسم کو قرار و یکسوئی میسر نہ تھی۔ ہلتا تھا۔ ذرا سی گندگی سے میلا اور بدبودار ہو جاتا تھا۔ جو رنگ اس میں ڈالا جائے فوراً اس کا اثر قبول کر کے وہی رنگ اختیار کر لیتا تھا۔ لیکن مجاہدہ مشین نے اس کے سارے تفرقہ انداز اجزاء کو فنا کر کے ایسا یکا متحد کر دیا کہ جس رُخ سے دیکھئے ایک ہی شکل نظر آتی ہے۔ اوپر بھی پانی، نیچے بھی پانی، اندر بھی پانی، باہر بھی پانی۔ اور سب خنک و سرد۔ اس کو کہتے ہیں وحدت کا کمال۔ اب اس پر گندگی ڈالیے تو پھسل کر بہہ جائے۔ رنگ ڈالیے تو وہ بھی اوپر اوپر سے اُڑ جائے گا۔ . . . . صوفی بھی جب برف کی طرح اپنے باطن کو مجتمع کر لیتا ہے تو پھر وہ خواہ کیسے ہی بدنما مقام میں جائے۔ اس پر کسی برائی کا اثر نہیں ہوتا!"

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ سب جگہ جاتے تھے اور ایک عام آدمی کی آنکھ اور جذبات لے کر جاتے تھے لیکن جب واپس آتے تھے تو ایک سبق اور ایک عرفان ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ بات کرتے کرتے بقول سید حامد صاحب وہ ایک گریز گی سی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور ایک دو فقروں میں وہ کچھ کہہ جاتے ہیں جو بڑے بڑے مضمونوں کے بس کا بھی نہیں ہوتا۔ ان کے سفرنامہ فلسطین و مصر و شام و حجاز کا ایک ٹکڑا دیکھیے:-

"باغ میں عیسائی عورت مرد سے زیادہ مصری عورت مرد تھے۔ مصری عورتیں اب اکثر بیباک اور آزاد ہوتی جاتی ہیں۔ پہلے ان کے نقاب میں ناک کے پاس ایک بدنما سونڈ سی لگی رہتی تھی جس کی ہر سیاح نے شکایت کی ہے۔ مگر اب اس کا رواج اٹھتا جاتا ہے۔ عورتیں صرف منہ پر جس میں تھوڑی سی ناک بھی چھپی رہتی ہے، ایک سیاہ ٹکڑا باندھ لیتی ہیں۔ باقی آنکھوں اور ان کے نیچے اوپر کے حصے کو نشانہ بازی کے لیے کھلا رکھتی ہیں اور یہ کپڑا بھی اس قدر نازک اور باریک ہوتا ہے کہ ہونٹوں کی سرخی صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ گویا وہ دکھاتی ہیں کہ پتلے ابر میں چاند ایسا ہوتا ہے۔ اور صاف آسمان میں چاند کی بہار دیکھنی ہو تو ذرا نگاہ تھوڑی سی اور اوپر کر لو۔ اور دیکھ لو۔ آنکھیں ایک تو ہوتی ہی عموماً سیاہ ہیں۔ اس پر سرمے کی سان پلکوں کی نوک کو اور بھی تیز کر دیتی ہے۔ اندر ایک سایہ سا ہوتا ہے جس کے اوپر ریشمی چادر۔ چلتی ہیں تو لچکتی ہوئی۔ چادر کو دانستہ پھسلاتی ہوئی۔ اور بناوٹی گھبراہٹ سے اِدھر اُدھر دیکھ کر سمٹتی ہوئی۔ نوجوان اس تماشے کی آرزو میں جگہ جگہ بنچوں پر موجود رہتے ہیں۔ اور سبز گھاس پر جا کر تو ان کی اٹھکھیلیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں۔ دوڑتی ہیں، ایک دوسرے سے الجھتی ہیں اور زمین کی طرف جھکی پڑتی ہیں۔ گویا کہ وہ نشے میں بے قابو ہیں یا گھاس کترنے کی قینچی ہیں جس کو یوروپ کا تمدن چلا رہا ہے۔ اور گھاس کے ساتھ ایمان اور تقدس کے بے خطا پودوں کو بھی کترتا چلا جاتا ہے۔"

حضرت خواجہ صاحب نے بے شمار خاکے اور قلمی چہرے بھی لکھے۔ بلکہ اردو میں قلمی چہرے لکھنے کا تو ان کو بانی کہنا چاہیے۔ قلمی چہروں کے سلسلے میں ان کے کینوس کی وسعت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اللہ میاں سے لے کر شیطان اور کچن اور سلوچنا فلم ایکٹرس تک سب پر لکھا۔ مگر مقصدیت کا دامن کبھی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ سلوچنا کے

قلمی چہرے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"قوم یہود دن — مذہب دل نوازی۔ پیشہ۔ فلم میں ناچنا اور سارے جسم سے شاعری کرنا۔ عمر تم پوچھو تو سولہ — وہ پوچھیں تو کبھی سولہ سے کم کبھی سولہ سے بہت زیادہ — اور کبھی انجان بن کر کہے اماں کو معلوم ہے کہ میں کے برس کی ہوں!

" اس کا اثر فلم دیکھنے والے ہندوستان کے لئے طاعون اور ہیضے اور ملیریا کے جراثیم سے زیادہ متعدی ہے۔ وہ اسٹیج کی حکمراں ہے جو توپوں، ہوائی جہازوں اور تباہ کن کشتیوں کے بغیر سینما دیکھنے والوں پر حکومت کرتی ہے۔ وہ انکم ٹیکس لگانے کے قابل ایک دولت ہے۔ اور نیلام کرنے اور شراب فروشوں کو ٹھیکے پر دینے کے لائق دیسی شراب ہے۔ وہ مجسم جوا ہے۔ ایسا جوا جہاں ہار کے سوا جیت کبھی نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسی قانون شکنی ہے جس کی روک تھام کے لئے کوئی آرڈی نینس نہیں بن سکتا۔ وہ بولتی ہوئی جھاڑو ہے جو غریب ہندوستانیوں کی جیب صاف کر کے دولت کا سارا کوڑا کرکٹ فلم کمپنیوں کی جیب میں پھینکتی رہتی ہے۔"

خواجہ صاحب کی تحریر اپنے سوز و گداز کے لئے مشہور ہے۔ آئیے اس کے کچھ نمونے پیش کیے جائیں گے لیکن ان کے طنز و مزاح کی طرف لوگوں کی نگاہ ابھی پوری طرح نہیں گئی ہے۔ اصل میں ان کی مذہبیت اور بزرگی کا لوگوں کو اس شدت سے احساس ہے اور مذہبیت اور بزرگی کے ساتھ سنجیدگی اور بسورتے فلسفی کے تصور کو لوگوں نے ایسا وابستہ کردیا ہے کہ اب کسی دیندار آدمی سے شگفتگی کی توقع ہی نہیں رکھی جاتی۔ خواجہ صاحب نے یہ برف بھی توڑی ہے۔ ان کے قلم سے ماڈرن معشوق کا حلیہ ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ اگر خواجہ صاحب کو طنز نگاروں اور مزاح نویسوں کی صف میں لاکر بٹھائیے تو وہاں بھی وہ نمایاں نظر آئیں گے۔

" قد ایسا جیسا اخبار کا کالم۔ بال ایسے جیسے تنخواہوں کی تخفیف۔ پیشانی

ایسی جیسے وہائٹ پیپر۔ بھویں ایسی جیسے اسمبلی ہال۔ پلکیں لکھنے کا باریک نب۔ آنکھیں ایکشا انبر وَن کے ننھے ننھے دو گلاس۔ نگاہیں کنزرویٹو گورنمنٹ کی پالیسی۔ رخسار بالشویک یا سرحدی سرخ پوش۔ ٹھوڑی برٹش ڈپلومیسی۔ ہونٹ انگریزی کھانے کی لال جیلی۔ دانت کانگریسی زبان کا جیل خانہ۔ گردن جودھپوری برجس۔ چھاتیاں پنیر کی چکتیاں۔ کمر ہندوستان کا اتفاق۔ بالوں کی کتر شامیانے کی جھالر۔ بالوں کا تیل چھچھوندر کے آنسو۔ چہرے کا پوڈر ملکی ہمدردی۔ ایسا نازک جیسے خطاب پرست کا دل۔ ایسا ضدی جیسے پولیس کا سپاہی۔ ایسا بے وفا جیسے دیسی لیڈر۔ اور ایسا ہرجائی جیسے تمباکو۔ اور ایسا منھ چڑھا جیسے چائے کی پیالی۔ چلتا ہے تو سگریٹ کے دھوئیں کی طرح بل کھاتا ہوا۔ دیکھتا ہے تو خوردبین بن جاتا ہے۔ بولتا ہے تو پیا تو معلوم ہوتا ہے۔ وہ پہلے درخت تھا۔ جانور تھا۔ اور ایک ڈراؤنا ہوا تھا۔ اب آدمی تو بن گیا ہے۔ مگر کچھ گورا ہے۔ کچھ کالا ہے۔ کچھ کچا ہے۔ کچھ پکا ہے۔ پہلے فرہاد، مجنوں اور رانجھا اس کے عاشق تھے۔ اور وہ شیریں۔ لیلےٰ ہیر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اب سب عورت مرد معشوق بن گئے ہیں کیونکہ ہر شخص مخاطب کو چاہے عورت ہو یا مرد ڈیر (پیارا پیاری) کہتا اور لکھتا ہے۔ اور معشوقیت میں بھی اب جمہوریت ہو گئی ہے۔"

خواجہ صاحب پر کئی دفعہ کفر کے فتوے لگے۔ لیکن اللہ میاں کا قلمی چہرہ انھوں نے ایسی چابکدستی اور ہوشیاری سے لکھا ہے کہ کسی مولوی کو گرفت کی کوئی چیز ہاتھ نہیں آئی۔ اس کا ایک چھوٹا سا اقتباس:

"بے صورت کی ایک مورت ہے۔ تارہ بھی نہیں۔ چاند بھی نہیں۔ سورج بھی نہیں۔ ہفت افلاک بھی نہیں۔ عرش و کرسی بھی نہیں۔ سمندر اور پہاڑ بھی نہیں۔ بہتا ہوا دریا بھی نہیں۔ ششدر اور حیران کنارہ بھی نہیں۔ کوندنے والی بجلی بھی نہیں، گرجنے والا بادل بھی نہیں جمادات

بھی نہیں۔ نباتات بھی نہیں۔ حیوان بھی نہیں۔ انسان بھی نہیں۔ وہ تو بس بے صورت کی ایک مورت ہے۔

"کیا وہ لیلےٰ کے چہرے کا حسن ہے؟ کیا وہ مجنوں کی آہ و بکا ہے؟ کیا وہ شیریں کی میٹھی بات ہے؟ کیا وہ فرہاد کی کوہ شکنی ہے؟ کیا وہ پھولوں سے بھری بہتے پانی میں اپنی شکل دیکھنے والی ہریالی ڈالی ہے؟ کیا وہ بل کھائی ہوئی زلف ہے؟ کیا وہ سرمئی آنکھ ہے؟ یا آنکھوں کا گلابی ڈورا ہے؟ یا نکیلی پلک ہے؟ یا گلابی رخسار ہے؟ یا لال ہونٹ ہے؟ یا موتی سا دانت ہے؟ یا چاہ زنخداں ہے؟ یا سرو ہے؟ یا قمری ہے؟ یا چکور ہے؟ یا چکوہ ہے؟ یا چکوی ہے؟ —— بے صورت کی ایک مورت ہے۔

"سب صورتیں اس کی۔ سب حلیے اس کے۔ سب چہرے اس کے۔ سب جلوے اس کے۔ سب روشنیاں اس کی۔ سب نور اُسی کے۔ سب اندھیرے اس کے۔ سب سیرتیں اس کی۔ سب خصلتیں اور جبلتیں اس کی بنائی ہوئی۔ اس کی بسائی ہوئی۔ اس کی پھیلائی ہوئی۔ سمندروں میں تلاطم اور طوفان۔ کناروں میں چپ چاپ خاموشی اور حیران۔ کلیوں میں برقع پوشی۔ کھلے ہوئے پھولوں میں پردے سے باہر۔ ہر ایک کی نظر سے ہم آغوشی۔ بہتے ہوئے پانی میں اسی کے دریا دل کی روانی۔ سوکھی خاک کے ذرّوں میں اُسی کی تشنہ لبی اور خشک سامانی۔ پھولوں میں اسی کی جوت۔ کانٹوں کی نوک میں اسی کی کھٹک۔ پھر بھی وہ بے صورت کی ایک مورت ہے!"

حضرت خواجہ صاحب بے صورت کی اس مورت سے تعلق محض رسمی نہیں رکھتے۔ ان کی عبادت اور دعا کا انداز بھی سب سے نرالا ہے۔ دیکھیے:

دکل رجب ۱۳۳۲ھ کی ۲۸ تاریخ تھی۔ معراج کی رات سوتے گذر گئی اس لئے کل رونا حصے میں آیا۔ رین بسیرے کے وسیع صحن میں بہت سے انسان

پچھلی رات کی خنک ہوا کا لطف اُٹھا رہے تھے اور بے خبر سوتے تھے۔ میری آنکھیں ان کی بے فکری اور بے خبری پر رشک کرتی تھیں اور دل کی بھٹی آنسو گرم کر کر کے بھیج رہی تھی۔ .... باہر آیا۔ تاروں نے اذان دی۔ افق نے حیران ہو کر کہا۔ نماز کا وقت نہیں ہوا۔ یہ کیسی اذان؟ تخت کا مصلے آہستہ سے بولا۔ وقت تہجد ہے۔ مگر کل کی رات کیسی غفلت میں کٹ گئی۔ خیر آج بھی کچھ نہیں گیا۔ چاہتا تھا کہ نیت باندھوں اور دل کی گرہ کھولوں کہ پھر کلیجے میں ایک تیر لگا۔ کوئی چیز سینے کے اندر جوش مارتی منہ کی جانب اُبلتی ہوئی آئی۔ میں نے آہ آہ کہہ کر اس بخار کو باہر پھینک دیا۔ اور کہا۔ سوئے دیپارے موئے! یہ میرے گھٹ کے اندر کیا چیز ہے۔ کم بخت یہ کیا بلا ہے۔ میری ساری رات برباد کر دی۔ جب میری آہ و فغاں نے کچھ اثر نہ کیا۔ سارے جسم پر اس نامعلوم زہر نے قبضہ کر لیا۔ میں بے قرار ہو گیا۔ میں نے نماز کے قانونی طریقے کو ترک کر دیا۔ اور بغیر قیام و رکوع سجدے کے آگے سر جھکا دیا۔ پیشانی کے نیچے خاک نہ تھی۔ تخت کی لکڑی تھی۔ اس پر سر دھرا تھا زمیں۔ میرا ماتھا اس پر رکھا تھا اور اس کی پڑوسن آنکھیں بے اختیار رو رہی تھیں۔ میں نے سبحان ربی الاعلیٰ نہیں کہا۔ میں نے ہندی میں اس کی تعریف کی۔ اس کی خوشامد کی۔ اس کی بڑائی بیان کی۔ جوں جوں میں اس کو جگ داتا پکارتا تھا۔ ووں ووں دل کی آگ بھڑکتی تھی۔ کیا میرا خدا ہندی زبان میری زبان سے سن رہا ہوگا؟ اس نے تو وعدہ کیا ہے۔ بندہ میری طرف ایک بالشت آتا ہے تو میں اس کی جانب ایک ہاتھ بڑھتا ہوں۔ آج وہ کہاں چلا گیا؟ مجھے کیوں رلاتا ہے؟ سامنے کیوں نہیں آتا ہے؟"

خواجہ صاحب کے لکھے ہوئے افسانے اور کہانیاں زیادہ تر انقلاب ۱۸۵۷ء کی بپتا سے متعلق ہیں۔ اس لئے ان میں بھی سوز و گداز کی بڑی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کہانی کا لطف اقتباس سے حاصل نہیں ہو سکتا تاہم اس کا نمونہ پیش کیے بغیر خواجہ صاحب کی تحریر اور اسٹائل

کا پورا اندازہ ممکن نہیں۔ بیگمات کے آنسو" کتاب کی ایک کہانی کا ابتدائی اور آخری حصّہ پیشِ خدمت ہے:۔

" گل بانو خدا رکھے پندرہ برس کی ہوئیں۔ جوانی کی راتوں نے گود میں لینا شروع کیا۔ مرادوں کے دن پہلو میں گدگدیاں کرنے لگے۔ مرزا دارا بخت بہادر سابق ولی عہد بہادر شاہ کی نورچشم ہیں۔ باپ نے بڑے چاؤ چوچلے سے پالا ہے۔ اور جس دن سے وہ دنیا کو چھوڑ قبر میں گئے۔ محل میں گل بانو کی ناز برداریاں پہلے سے بھی زیادہ ہونے لگیں۔ اماں کہتی ہیں۔ نگوڑی کے دل کو بہت صدمہ پہنچا ہے۔ باپ کا مٹر کا نہ کرے۔ اس کی ایسی دلداری کرو کہ ان کی محبتوں کو بھول جائے۔ اُدھر دادا یعنی بہادر شاہ کا یہ عالم ہے کہ پوتی کے لاڈ میں کسی بات سے دریغ نہیں کرتے۔

"جب گل بانو نے پندرھویں سال میں قدم رکھا تو شباب نے بچپن کی ضد اور شرارتیں تو رخصت کر دیں۔ مگر دل ربائی کی شوخیاں اس ستم کی پیدا کیں کہ محل کا بچہ بچہ پناہ مانگتا تھا۔ سونے کے چھپر کھٹ میں دوشالہ تانے سویا کرتی تھیں۔ شام کو چراغ جلے اور بانو چھپر کھٹ پر پہنچیں۔ ماں کہتیں "چراغ میں بتی پڑی۔ لاڈو پلنگ چڑھی" تو وہ مسکرا کر انگڑائی اور جمائی لے کر سر کے بکھرے بالوں کو ماتھے سے سمیٹ کر کہتیں۔ ہاں بی۔ تم کو کیا۔ سوتے ہیں۔ وقت کھوتے ہیں۔ تمہارا کیا لیتے ہیں۔ تم ناحق کوئلوں پر لوٹی جاتی ہو . . . . .

. . . . !

" ایک دن مرزا (دادر شکوہ) گل بانو کے پاس آئے تو دیکھا بانو سیاہ دوشالہ اوڑھے سنہری چھپر کھٹ سفید پھولوں کی سیج پر پاؤں پھیلائے بے خبر پڑی سوتی ہیں۔ منہ کھلا ہوا ہے۔ اپنے ہی بازو پر سر رکھا ہے۔ تکیہ الگ پڑا ہے۔ دونوں لونڈیاں مکھیاں اڑا رہی ہیں۔

" دادر شکوہ جی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ مگر کن انکھیوں سے

گل بانو کا عالم مخموری دیکھتا جاتا تھا۔ آخر نہ رہا گیا اور بولا۔ کیوں چچی حضرت! بانو اتنے دن چڑھے تک سوتی رہتی ہیں؟ دھوپ قریب آگئی۔ اب ان کو جگا دینا چاہیے۔ چچی نے کہا۔ بیٹا بانو کے مزاج کو جانتے ہو۔ کس کی شامت آئی ہے جوان کو جگائے۔ آفت برپا ہو جائے گی۔ داور نے کہا۔ دیکھیے میں جگاتا ہوں۔ دیکھوں کیا کرتی ہیں۔ چچی ہنس کر بولیں۔ جگا دو تم سے کیا کہیں گی۔ تمہارا تو بہت لحاظ کرتی ہیں۔ داور نے جا کر تلوے میں گدگدیاں کیں۔ بانو نے انگڑائی لے کر پاؤں سمیٹ لیا۔ اور بے اختیار آنکھیں کھول کر نگاہِ طیش سے پائنتی کی طرف دیکھا۔ اس کو خیال تھا کہ کسی لونڈی کی شرارت ہے۔ اس کو گستاخی کی سزا دی جاتی۔ مگر جب اس نے ایسے شخص کو سامنے کھڑا دیکھا جس سے خود اس کا دل محبت کرتا تھا تو شرم سے اس نے دوشالے کا آنچل منہ پر ڈال لیا اور گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ داور نے اس ہوش پاش منظر کو دل تھام کر دیکھا اور بے اختیار چیخ کر بولا۔ لو چچی حضرت! میں نے بانو کو اُٹھا بٹھایا!

غدر کے نو مہینے بعد

"درگاہ حضرت چراغ دہلیؒ کے ایک گوشے میں ایک قبول صورت عورت پھٹا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت ہائے ہائے کر رہی تھی۔ سردی کا مینہ دھواں دھار برس رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے بوچھاڑ اس جگہ کو تر کر رہی تھی جہاں اس عورت کا بستر تھا۔

"یہ عورت سخت بیمار تھی۔ پسلی کے درد، بخار اور بے کسی میں اکیلی پڑی تڑپتی تھی۔ بخار کی بے ہوشی میں اس نے آواز دی۔ گلبدن۔ اری او گلبدن! مردار مر گئی۔ جلدی آ اور مجھ کو دوشالہ اوڑھا دے۔ دیکھ بوچھاڑ اندر آتی ہے۔ پردے چھوڑ دے۔ روشنک تو ہی آ۔ گلبدن تو کہیں غارت ہو گئی۔ میرے پاس کوئلوں کی انگیٹھی لا۔ پسلی پر تیل مل۔ ارے د۔ د۔ میرا سانس رُکا جاتا ہے۔

"جب کوئی اس آواز پر بھی اس کے پاس نہ آیا تو اس نے کمبل چہرے سے ہٹایا اور چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرے دالان میں خاک کے بچھونے پر تنہا پڑی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مینھ سناٹے سے برس رہا تھا۔ بجلی چمکتی تھی تو ایک سفید قبر کی جھلک دکھائی دیتی تھی جو اس کے باپ کی تھی۔

"یہ حالت دیکھ کر اس عورت نے ایک نعرہ مارا اور کہا۔ بابا! میں تمہاری گل بانو ہوں۔ دیکھو اکیلی ہوں۔ اٹھو مجھے بخار چڑھ رہا ہے۔ آہ میری پسلی میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میرے پاس اس بوسیدہ کمبل کے سوا اوڑھنے کو کچھ نہیں ہے۔ میری اماں مجھ سے بچھڑ گئیں۔ میں محلوں سے جلاوطن ہو گئی۔ بابا اپنی قبر میں مجھے بلا لو۔ اچھی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ کفن سے منہ نکالو۔ اور مجھ کو دیکھو۔ میں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔ میرے بدن میں اس گیلی زمین کے کنکر چبھتے ہیں۔ میں اینٹ پر سر رکھے لیٹی ہوں۔

"میرا چھپر کھٹ کیا ہوا۔ میرا دوشالہ کہاں گیا۔ میری سیج کدھر گئی۔ ابا۔ ابا۔ اٹھو جی کب تک سوئے گے۔ ہائے درد۔ افوہ۔ سانس کیوں کر لوں؟"

حضرت خواجہ صاحب کی ایک معرکۃ الآرا کتاب نظامی بنسری ہے جس میں انھوں نے سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیارحؒ کے حالاتِ زندگی درج کیے ہیں۔ اور ان کی تعلیمات کو ایسے دل موہ لینے والے انداز میں بیان کیا ہے کہ کیا کہیے۔ مگر اس کا مختصر اقتباس ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اس ذکرِ خیر سے یہ مضمون محروم رہے گا۔

شمس العلما، مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی تحریروں کا آئینہ جلوۂ صد رنگ دکھاتا ہے۔ ان کا قلم کہیں بند نہیں۔ جیسی ان کی شخصیت پہلو دار تھی۔ ویسا ہی تنوع ان کی تحریروں میں ہے۔ انشائیے۔ فکاہیے۔ تبصرے۔ ہلکے پھلکے اخباری نوٹ۔ بھاری بھر کم علمی مضامین۔ سوانح عمریاں۔ تذکرے۔ ناول۔ افسانے۔ روزنامچے کیا کچھ انھوں نے نہیں لکھا۔ ان بے شمار تحریروں سے انتخاب اور اقتباس آسان نہیں۔ اس لیے کوئی اہم چیز چھوٹ گئی ہو ان کی شخصیت کا پورا عکس اس آئینے میں نہ ابھرا ہو تو مجھے معاف کیا جائے۔ کیونکہ بقول کسے رات تھوڑی، راماین بہت۔

خاص کر ان کے روزنامچے کا اقتباس وقت کی کمی کے باعث ارادے کے باوجود میں نہیں دے سکا۔
البتہ خواجہ صاحب کی قبر کا کتبہ نقل کئے بغیر یہ مضمون بالکل ادھورا رہے گا۔ انھوں نے ایک کتاب قبروں کے غیبی نوشتے کے نام سے لکھی تھی جس میں دنیا کے اچھے بُرے بہت سے مشہور لوگوں کی قبروں کے خیالی کتبے تحریر کیے تھے۔ اس میں یزید کی قبر کا کتبہ بھی ہے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی قبر کا کتبہ بھی۔ اور خواجہ صاحب نے خود اپنی قبر کا کتبہ بھی پیشگی تحریر کردیا تھا۔ اور وہی آج ان کی لوحِ مزار پر لکھا ہوا ہے:

"یہ قبر ایک مسلمان کی ہے۔ اس خاک میں وہ سوتا ہے جس نے دنیا کی بیداری میں سونے والوں کو جگانے کی خاطر اچھی اور بری موت کا فرق قلم کی بجلی سے زندہ کرکے دکھادیا۔

چار دن کی شہرت پر گھمنڈ نہ کرنا

کہ یہ بھی بہت مشہور تھا۔ قوتِ تحریر و تقریر کا غرور دل میں نہ لانا کہ اس کی طاقتِ انشاء پردازی نے بھی تمام ہندوستان میں دھاک بٹھادی تھی۔ مگر آج وہ ساری دھوم اس تودۂ خاک میں چپ چاپ پڑی ہے۔ یہ اس کی قبر ہے جس نے الواحِ قبور اس وقت لکھیں جب کہ دنیا کی کسی زبان میں ان کی نظیر موجود نہ تھی۔ لیکن یہ بے مثال باتیں ایجاد کرنے والا بھی آخر مر گیا — اور کہہ گیا کہ

کام آخرت کی نیت سے کرنا

جس کا نتیجہ لازوال ہے۔ اس زندگی کے لیے نہیں جہاں کا رہنا چند ساعت کا خواب و خیال ہے!"

خواجہ مہدی نظامی

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

ذاتی اور خاندانی حالات

نام : سید علی حسن عرف حسن نظامی۔ علامہ اقبال نے خواجہ حسن نظامی لکھنا شروع کیا۔ اور اس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

مصورِ فطرت، امام المشائخ عوامی خطابات ہیں۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔

تاریخ پیدائش : ۲ محرم ۱۲۹۶ھ (مطابق ۸۰-۱۸۷۹ء) بستی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، دہلی میں ولادت ہوئی۔

والد کا نام حافظ سید عاشق علی نظامی اور والدہ کا نام سیدہ چھیتی بیگم تھا۔ خواجہ صاحب گیارہ سال کے تھے کہ ماں باپ دونوں ایک سال کے اندر انتقال کر گئے اور بڑے بھائی سید حسن علی شاہ نے ان کی سرپرستی کی۔

خاندانی حالات : خواجہ صاحب کے اجداد مہاراجہ پرتھوی راج چوہان کے زمانہ میں بخارا سے ہجرت کر کے ہندوستان آگئے تھے۔ اور قدیم تاریخوں اور تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مہاراجہ کے دربار میں رسوخ حاصل تھا۔ ایک بزرگ خواجہ سید بدرالدین اسحٰقؒ بہت بڑے عالم اور صاحب تصنیف تھے۔ ان کی شادی حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی صاحبزادی حضرت بی بی فاطمہؓ سے ہوئی۔ اور بابا صاحبؒ نے ان کو خلافت بھی دی

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اجودھن (موجودہ پاک پٹن ضلع ساہیوال پاکستان) گئے تھے تو خواجہ بدرالدین اسحقؒ کے پاس ہی ٹھہرے تھے اور دونوں میں ایسا تعلق تھا کہ حضرت بابا صاحبؒ اور حضرت بدر اسحقؒ کا وصال ہوگیا تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے ان کے دونوں کمسن لڑکوں خواجہ سید محمد امامؒ اور خواجہ سید موسیٰؒ کو اپنے پاس دہلی بلالیا اولاد کی طرح پرورش کی اور ایسی خلافت عطا فرمائی کہ لوگ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے مرید ہونے آتے تو وہ انھیں خواجہ سید محمد امام نظامی کا مرید ہونے کا حکم دیتے۔ اپنی مجلس میں سب سے اونچی جگہ انھیں بٹھاتے اور باہر کی دعوتوں میں اپنا قائم مقام بناکر بھیجتے اور نماز میں ان کو امام بناتے۔ خواجہ سید محمد امام نظامی کی اولاد کی شادیاں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی بہن کی اولاد سے ہوئیں۔ حضرت خواجہ حسن نظامی انہی خواجہ سید محمد امام نظامی کی اولاد میں تھے اور ان کا خاندان درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے متعلق چار خاندانوں میں فریق اول بنیرگان کہلاتا ہے۔ خواجہ صاحب کا شجرہ نسب یہ ہے:-

۱۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ
۲۔ حضرت امام حسین علیہ السلام
۳۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام
۴۔ حضرت سید عمر اشرفؒ
۵۔ حضرت سید زکریا اصغر محدثؒ
۶۔ حضرت سید قطب الدین عمر شجریؒ
۷۔ حضرت ابو عبداللہ محمدؒ
۸۔ حضرت سید علی صدر الدینؒ
۹۔ حضرت سید حسن جلال الدینؒ
۱۰۔ حضرت سید احمد فتح اللہؒ
۱۱۔ حضرت سید محمدؒ

۱۲۔ حضرت سید احمدؒ

۱۳۔ حضرت سید محمدؒ

۱۴۔ حضرت سید محمودؒ

۱۵۔ حضرت سید احمدؒ

۱۶۔ حضرت سید منہاج الدینؒ

۱۷۔ حضرت سید اسحٰقؒ

۱۸۔ حضرت خواجہ سید علی لالہؒ

۱۹۔ حضرت مولانا سید بدر الدین اسحٰقؒ

۲۰۔ حضرت خواجہ سید محمد امام نظامیؒ

۲۱۔ حضرت خواجہ سید داؤد نظامیؒ

۲۲۔ حضرت خواجہ سید علیم الدین نظامیؒ

۲۳۔ حضرت خواجہ سید حُسین نظامیؒ

۲۴۔ حضرت خواجہ سید مُبارک نظامیؒ

۲۵۔ حضرت خواجہ سید محمد نظامیؒ

۲۶۔ حضرت سید خواجہ نظامیؒ

۲۷۔ حضرت خواجہ سید جلال الدین نظامیؒ

۲۸۔ حضرت خواجہ سید ایوب نظامیؒ

۲۹۔ حضرت خواجہ سید ابو محمد نظامیؒ

۳۰۔ حضرت خواجہ سید عبد اللہ نظامیؒ

۳۱۔ حضرت خواجہ سید عبد القادر نظامیؒ

۳۲۔ حضرت آغا سید فضل علی نظامیؒ

۳۳۔ حضرت خواجہ سید ہدایت علی نظامیؒ

۳۴۔ حضرت سید خواجہ حسن علی نظامیؒ

۳۵- حضرت حافظ سید عاشق علی نظامیؒ

۳۶- حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

تعلیم: ابتدائی تعلیم بستی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا. میں حضرت مولانا اسمٰعیل کاندھلوی، حضرت مولانا محمد میاں کاندھلوی اور حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی (والد ماجد حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم) سے حاصل کی۔ صرف ایک دن کے لئے انگریزی اسکول میں بھی گئے۔ دہلی میں مولوی وصیت علی صاحب مرحوم، مولوی عبدالعلی محدث دہلوی، مولوی حکیم الہ دین پنجابی اور مولوی حکیم رضی الحسن صاحب کاندھلوی سے بھی پڑھا۔ اور آخر میں حضرت مولانا محمد یحییٰ خواجہ صاحب کو حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے مدرسے میں گنگوہ لے گئے اور وہاں انھوں نے ڈیڑھ سال تک تعلیم پائی۔

پہلی شادی: گنگوہ سے واپسی پر اٹھارہ سال کی عمر میں خواجہ صاحب کی پہلی شادی ان کے چچا سید معشوق علی کی لڑکی سیدہ حبیب بانو سے ہوئی چند سال بعد رمضان ۱۳۲۰ھ میں پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا۔

ارادت: گیارہ سال کی عمر میں خواجہ صاحب کو ان کے والد نے حضرت شاہ اللہ بخش صاحب تونسویؒ کا مرید کرا دیا تھا مگر ان کا جلدی وصال ہوگیا۔ اس کے بعد بڑے بھائی نے پنجابی زبان کے مشہور شاعر بزرگ حضرت خواجہ غلام فرید صاحبؒ سے بیعت کرا دیا۔ مگر انھوں نے بھی رحلت فرمائی اور چوبیس سال کی عمر میں خود اپنے ارادے اور حضرت بابا فریدؒ کے روحانی اشارے کی بنا پر خواجہ صاحب نے حضرت پیر مہر علی شاہ چشتی نظامیؒ سجادہ نشین خانقاہ گولڑہ شریف ضلع راولپنڈی سے بیعت کی اور خلافت پائی۔

تیرتھ یاترا: ۶-۵-۱۹۰۵ء میں اپنے نو مسلم مربی غلام نظام الدین صاحب خاکسار کے شوق دلانے پر سادھوؤں کے لباس میں تمام ہندو تیرتھوں کی یاترا کی اور فلسفہ ویدانت سیکھا۔ اپنا سفر نامہ "تیرتھ یاترا" کے نام سے لکھا جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ کفر کا فتویٰ لگا۔

پہلا مضمون: پہلا مضمون "انڈیا کی نازک حالت" کے عنوان سے "انڈیا گزٹ" بمبئی

میں لکھا، پھر پیسہ اخبار لاہور، وکیل امرتسر، سر عبدالقادر کے مخزن اور پنڈی بہاء الدین کے رسالہ "صوفی" وغیرہ میں مسلسل لکھتے رہے۔

پہلی کتاب: پہلی کتاب "مفلسی کا مجرب علاج" لکھی۔

حلقہ نظام المشائخ کا قیام: ۱۹۰۸ء میں درگاہوں اور خانقاہوں کی اصلاح اور تعلیمات تصوف کی ترویج و اشاعت کے لئے حلقہ نظام المشائخ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس حلقے کے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی اور حضرت شاہ سلیمان پھلواروی جیسے بہت سے مشاہیر ممبر تھے۔

پہلا رسالہ: ۱۹۰۹ء میں حلقہ نظام المشائخ کے آرگن کی حیثیت سے ملا واحدی صاحب کی شرکت میں رسالہ نظام المشائخ جاری کیا۔

اسلامی ممالک کا سفر: حلقہ نظام المشائخ کے مقاصد کی اشاعت کے لئے ۱۹۱۱ء میں مصر، شام، فلسطین، حجاز وغیرہ اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ اور سفر کے دوران مولوی برکت اللہ وغیرہ انقلابیوں سے بھی ملے۔ اور خفیہ رپورٹوں کی بنا پر سفر سے واپسی پر مسلسل چھ برس تک پولیس کی نگرانی رہی اور متعدد بار حراست میں لیا گیا۔

اخبار توحید: ۱۹۱۲ء میں میرٹھ سے اخبار توحید جاری ہوا جس کے خواجہ صاحب ایڈیٹر مقرر ہوتے۔ اسی زمانے میں کانپور کی مسجد کا ہنگامہ ہوا اور خواجہ صاحب نے میرٹھ کی جامع مسجد میں "کہو تکبیر" کے عنوان سے انگریزوں کے خلاف ایک تقریر کی۔ اس تقریر کی اشاعت پر اخبار توحید ضبط کر لیا گیا۔

دوسری شادی: ۱۹۱۶ء سیدہ محمودہ خواجہ بانو سے خواجہ صاحب کی دوسری شادی ہوئی۔

تصنیف و تالیف: دوسری شادی کے بعد خواجہ صاحب نے کتابیں لکھنے کی طرف توجہ کی اور چھوٹی بڑی کئی سو کتابیں اور رسالے تصنیف و تالیف کئے۔ متعدد روزانہ، دو وقتہ، سہ روزہ، ہفتے وار اور ماہانہ اخبار، رسالے جاری کئے۔ رسالہ "منادی" ۱۹۲۰ء سے چھپنا شروع ہوا اور سب سے

طویل مدت تک خواجہ صاحب نے اسی رسالے کو ایڈٹ کیا۔

رحلت: ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ کا دن گذرنے کے بعد مغرب اور عشاء کے درمیان رحلت فرمائی۔ عیسوی تاریخ ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء اتوار اور پیر کی درمیانی شب تھی اپنی قبر انھوں نے پچاس برس پہلے ہی بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی میں تیار کرا رکھی تھی اسی میں دفن ہوئے۔

مانگے کا اجالا

پروفیسر مشیر الحق

خواجہ حسن نظامی مترجم و مفسّرِ قرآن

خواجہ صاحب دنیائے ادب میں ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اگرچہ ادب کو "ابلاغ" کے ایک ذریعے کے طور پر اپنایا تھا لیکن ان کے معاملے میں ہوا یہ کہ جو درحقیقت "ذریعہ" تھا وہی آگے چل کر "اصل" قرار پایا حالانکہ اصلاً وہ ایک مبلّغ تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی رہے اور جس حال میں بھی رہے اپنے کو مبلّغ سمجھتے رہے۔ خواجہ صاحب نے مختلف مذہبی عنوانات پر چھوٹے بڑے، بھاری ہلکے ہر قسم کے مضامین لکھے، تصوف کے مسائل حل کیے، بخاری شریف کے چند پاروں کو اردو میں منتقل کیا۔ لیکن درحقیقت مذہبی لٹریچر کے میدان میں انھوں نے جو اپنی جگہ بنائی ہے وہ اصلاً قرآن کے ترجمے اور تفسیر کی وجہ سے ہے۔

خواجہ صاحب ایک مبلّغ تھے، لیکن ان کی تبلیغ کا ایک خاص انداز تھا، وہ اثباتی طرزِ فکر میں یقین رکھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اسلام کے اصل اصول یعنی قرآن کو عام فہم اردو اور ہندی میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے تاکہ لوگ جزوی باتوں میں الجھنے کے بجائے خود اصل کو اپنی زبان میں پڑھ کر سمجھ سکیں۔ ایسا نہیں ہے کہ خواجہ صاحب سے پہلے لوگوں نے قرآن کا ترجمہ نہیں کیا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کے رائج اردو ترجمے یا تو قدیم زبان میں تھے اور ان میں قرآنی الفاظ کی تراکیب کا اس حد تک خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ عام فہم نہیں رہ جاتے تھے، یا پھر اتنی

بامحاورہ اردو میں تھے کہ پڑھنے والے کو زبان کا لطف بھلے ہی آتا ہو لیکن الفاظِ قرآنی سے قربت باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ خواجہ صاحب نے ان دونوں رجحانات کے بین بین راستہ اختیار کیا اور ایک ایسی زبان میں ترجمہ کیا جو لفظی ہونے کے ساتھ بامحاورہ بھی تھی۔ اس وقت کی مروّجہ تفسیروں اور ترجموں سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ اس لیے انھوں نے "سب خرابیوں کو محسوس کرنے کے بعد ایک تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا اور طے کرلیا کہ میری مخاطب عورتیں ہیں، بچے ہیں، کم لیاقت کے مسلمان ہیں جو تمام مسلمانوں کی تعداد میں آدھے سے بھی زیادہ ہیں، مجھ کو ایسی تفسیر لکھنی چاہیے جو آج کل کی صاف اور سلیس زبان میں تو ہو مگر زبان دانی کے محاورے لکھنے کی تلاش میں قرآن شریف کے مفہوم کی ادائیگی فوت نہ ہو جائے۔ نہ اس میں بہت زیادہ طوالت ہو نہ بہت زیادہ اختصار ہو بلکہ صرف قرآن شریف کے مطالب اور مقاصد اور احکام اور قوانین کو عام فہم بنادیں"۔[1]

خواجہ صاحب ہر میدان میں منفرد رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ ترجمۂ قرآن کے میدان میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت پورے طور سے باقی رکھی ہے۔ اس وقت تک ترجمے اور تشریحی نوٹوں کا رواج اس طرح تھا کہ بین السطور میں تو اردو ترجمہ دیا جاتا تھا اور حاشیوں پر تفسیر اور تشریح ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب نے اس کے برخلاف ایک نئی طرز اپنائی۔ وہ پہلے قرآن کی ایک آیت لکھتے ہیں۔ اس کے نیچے شاہ رفیع الدین صاحب کا اردو ترجمہ دیتے ہیں جو اپنی صحت کے اعتبار سے سند کا درجہ رکھتا ہے، اس کے نیچے اپنا ترجمہ دیتے ہیں اور ترجمے کی عبارت کے ساتھ ہی ساتھ جہاں ضرورت سمجھتے ہیں تفسیری نکات کو قوسین میں لکھتے چلے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب کا ترجمہ شائع کرنے کی اصل وجہ تو یہ رہی ہوگی کہ اگرچہ وہ عربی جانتے تھے اور لغت کی مدد لیے بغیر قرآن شریف کا "بے تکان قلم برداشتہ ترجمہ" کرسکتے تھے پھر بھی وہ اپنے کو "مستند اور ضابطے کا مولوی" نہیں سمجھتے تھے، اس لیے احتیاطاً انھوں نے یہ سوچا ہوگا کہ شاہ صاحب کا ترجمہ ان لوگوں کی

---

[1] خواجہ حسن نظامی "عام فہم تفسیر" درویش پریس دہلی ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء، ص ۵۔

زبانوں کو بند کر دینے کے لیے کافی ہوگا جو ان کے ترجمے پر بعد میں "ضابطے کا مولوی" نہ ہونے کے باعث اعتراضات کی بوچھار کرتے ۔ بہر حال جو وجہ بھی رہی ہو یہ خصوصیت انھوں نے ضرور برتی ہے کہ اپنے ترجمے کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کا ترجمہ دے کر پڑھنے والوں کو وہ دو ایسے ترجموں سے بیک وقت متعارف کراتے ہیں جن میں ایک صدی سے زیادہ کا فصل ہے۔ میں اس موقع پر صرف ایک آیت کے دونوں ترجمے پیش کر رہا ہوں۔ تاکہ آپ کے سامنے خواجہ صاحب کا طرز انشا پورے طور سے آجائے۔ قرآن شریف میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ اہالیانِ مکہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ رسول خود قرآن کے مصنف ہیں تو تم بھی تو اہلِ زبان ہو ایک سورۃ تصنیف کر کے لاؤ تو ذرا۔ اس آیت کا ترجمہ شاہ صاحب کے الفاظ میں یوں ہے:

"اور اگر ہو تم بیچ شک کے، اس چیز سے کہ اتاری ہم نے اوپر بندے اپنے کے، پس لے آؤ ایک سورۃ مانند اس کے اور پکارو شاہدوں اپنوں کو، سوائے اللہ کے، اگر ہو تم سچے۔"

آیت کا یہ ترجمہ دینے کے بعد خواجہ صاحب خود اپنا ترجمہ دیتے ہیں۔ پہلے میں آپ کو صرف ترجمہ سناؤں گا، اس کے بعد اسی ترجمے کو ان کی اس تفسیر کے ساتھ جسے انھوں نے جگہ جگہ قوسین میں بڑھایا ہے سناؤں گا اس طرح آپ تینوں کے فرق کو بخوبی دیکھ سکیں گے صرف ترجمہ تو یوں ہے:

"اور جو ہم نے اپنے بندے پر آتارا ہے اس کی نسبت اگر تمھیں شک ہے تو اس جیسی ایک سورۃ تم لے آؤ اور خدا کے سوا اپنے مددگاروں کو بدلو، اگر تم سچے ہو۔"

اب اس ترجمے کو تفسیر کے ساتھ سنیے:

"اور جو (کلام) ہم نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر آتارا ہے اس کی نسبت اگر تمھیں شک ہے (کہ یہ انھوں نے خود تصنیف کر لیا ہے خدا کا اس سے تعلق نہیں) تو ایک فیصلہ رہا محمد بھی انسان ہیں اور تم بھی انسان ہو اور یہ آپ پڑھے لکھے بھی نہیں اور تمھاری ہمہ دانی کے دعووں کا کچھ ٹھکانا نہیں، تو اس جیسی

(صرف) ایک (چھوٹی سے چھوٹی) سورۃ تم (بھی بنا کر) لے آؤ اور (تم اکیلے ہی نہیں) خدا کے سوا اپنے (کل) مددگاروں (یا معبودوں) کو (بھی) بلا لو (کہ تمہارا ہاتھ بٹائیں) اگر تم سچے ہو (تو مقابلے میں آؤ)۔[1]

شاید صوفی ہونے کے ناطے خواجہ صاحب نے یہ بھی طے کیا کہ ہر پارے کے آخر میں اس پارے کی آیات و کلمات کے وہ سینہ بہ سینہ اور پوشیدہ اعمال و اذکار درج کیے جائیں جو تمام سلاسل کے بزرگانِ تصوف اور خود ان کے اپنے تجربے میں آچکے تھے اور جن کا مجموعی انکشاف، خواجہ صاحب کے بقول، کسی جگہ اور کسی کتاب میں نہیں ہوا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ یہ اعمال ہر پارے کے آخر میں بطور ضمیمے کے لگا دیے جائیں تاکہ عام فہم تفسیر کے سلسلے میں وہ خارج نہ ہوں۔

معلوم نہیں کیوں خواجہ صاحب اپنے اس خیال کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے، صرف پہلے پارے کے آخر میں ۸ صفحات کا ایک ضمیمہ لگایا جس میں سورۂ فاتحہ اور لفظ "الف لام میم" کے خواص اور اعمال درج کیے لیکن اس کے بعد جو پارے شائع ہوئے ہیں ان میں سے کسی میں بھی ایسا ضمیمہ نہیں ہے۔ خواجہ صاحب نے جب ہر پارے کے آخر میں اس پارے کی آیات کے خواص و اعمال کو دینا چاہا تھا تو بعض مشائخ نے انھیں اس سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی کیوں کہ ان کے خیال میں یہ چیزیں عام کرنے کی نہ تھیں۔ اس وقت خواجہ صاحب ان کے خیال سے متفق نہ تھے۔ ممکن ہے پہلے پارے کے بعد اپنے ہم عصر مشائخ کے اصرار سے مجبور ہو کر انھوں نے اس سلسلے کو بند کر دینا ہی مناسب سمجھا ہو۔

سورۂ فاتحہ کے کئی سو عمل خواجہ صاحب کو معلوم تھے جن میں سے چند کے "تیر بہدف" ہونے کا انھیں ذاتی تجربہ تھا انھوں نے اس قسم کے اپنے مجرب پانچ اعمال شائع کیے تھے جن میں دشمن کو مطیع کرنے کا ایک عمل یہ تھا کہ "زوالِ مہتاب کی تاریخوں

---

[1] خواجہ حسن نظامی "عام فہم تفسیر" درویش پریس دہلی ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء ص ۱۹۔

میں کورے ٹھیکرے پر کوئلے سے اپنے دشمنوں کے نام لکھ کر اس کے نیچے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین لکھا جائے اور اسی طرح کی سات ٹھیکریاں روزانہ زوال آفتاب کے وقت لکھ کر انھیں کنویں، ندی یا تالاب میں ڈال دیا جائے یہ عمل چاند کے آخری عشرے میں ہونا چاہیے۔ سات دن کے اندر دشمن مطیع ہو جائیں گے، یا ان کے شر سے عامل محفوظ ہو جائے گا۔[1]

خواجہ صاحب کو اس خطرے کا احساس تھا کہ سہولت پسند طبائع کہیں محنت سے بچنے کی خاطر صرف ان اعمال ہی پر تکیہ کر کے نہ بیٹھ رہیں اسی لیے انھوں نے شروع ہی میں یہ آگاہی بھی دے دی تھی کہ:

"لوگ آج کل کے زمانے میں کسب اور محنت چھوڑ کر انہی اعمال کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور انھوں نے یہ خیال قائم کر لیا ہے کہ بغیر محنت اور بغیر ہاتھ پاؤں کی سعی اور کوشش کے محض ان اعمال کی برکت سے ہماری تمام دنیاوی ضروریات پوری ہو جائیں گی، حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ حکم یہ ہے کہ اپنی ظاہری محنت اور کوشش کو جاری رکھا جائے اور پھر ان اعمال کو بھی پڑھا جائے تاکہ ان اعمال کی برکت سے سعی اور کوشش میں کامیابی ہو۔ یعنی ان اعمال کی تاثیر انسان کی ذاتی محنت اور سعی کے بغیر ظاہر نہیں ہوتی۔ کوشش اور محنت انسان کی ہوتی ہے اور ان اعمال کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کوشش اور محنت کو پورا کر دیتا ہے۔"[2]

خواجہ صاحب نے اس تفسیر کو چھ سال میں مکمل کیا تھا[3] ان کے عزیز ترین مرید ملا محمد واحدی مرحوم نے ۱۹۲۴ء میں جب پہلی بار اس ترجمہ و تفسیر کو شائع کیا تو اس کا نام "عام فہم تفسیر" تھا لیکن ۲۲، ۲۳ برس بعد جب ۱۹۴۶ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن دفتر منادی سے شائع ہوا تو لفظ "ترجمہ" کا اضافہ کر کے اسے "عام فہم ترجمہ اور تفسیر" کے نام

---

[1] خواجہ حسن نظامی "عام فہم تفسیر" درویش پریس دہلی ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء ص ۷۷۔

[2] ایضاً ص ۷۴۔ [3] نیا ترجمہ خواجہ حسن نظامی (پارہ عم)، دفتر منادی ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء ص ۲۶۔

سے شائع کیا گیا۔

خواجہ صاحب نے اسی ایک ترجمے پر بس نہ کیا، اس ترجمے کے دوران ہی انھوں نے "ہندی جاننے والے مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے"[1] ۱۹۲۲ء میں قرآن شریف کے ایک ہندی ترجمے اور تفسیر کا کام شروع کر دیا تھا، برس تک وہ اس ترجمے پر کام کرتے رہے اس طرح ۱۹۲۹ء میں یہ کام مکمل ہوا جسے پہلی بار ابن عربی کارکن حلقۂ مشائخ دہلی نے ۹۰۰ صفحات پر مشتمل بڑے سائز کی دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ اس ترجمے میں خواجہ صاحب نے یہ انداز اختیار کیا کہ ہر صفحے پر ایک گوشے میں قرآن کا متن دیا اور اس میں بھی یہ ندرت رکھی کہ متن اس "حمائل سائز" قرآن کا فوٹو ہو جو اورنگ زیب کی طرف منسوب ہے۔ اسی متنِ قرآن کے سامنے انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے مشہور اردو ترجمے کو ناگری رسم الخط میں شائع کیا اس کے ساتھ ساتھ نیچے خود اپنا ترجمہ و تفسیر دی جسے ایک نومسلم فاضل پنڈت مولانا غلام محمد صاحب (فاضل دیوبند) اور متعدد مسلم و غیر مسلم اہل علم کی مدد سے ہندی میں منتقل کیا گیا تھا[2] ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے کو اردو محاورے کی بیاض کہا جاتا ہے اس لیے اگر دیکھا جائے تو صرف اس کا رسم الخط بدل دینے سے کوئی فائدہ نہ تھا، لیکن جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے خواجہ صاحب ہر چیز میں کوئی نہ کوئی نیا رخ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنے اردو ترجمے میں انھوں نے شاہ صاحب کے اور اپنے ترجمے کو یک جائی طور سے دے کر اردو زبان کے ایک صدی کے سفر کی طرف اشارہ کیا تھا تو یہاں ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے کو ہندی رسم الخط میں شائع کر کے ہندی داں طبقے کو "محاوراتی اردو" سے روشناس کرایا۔ ہندی پڑھنے والوں پر ڈپٹی صاحب اور خواجہ صاحب کے ترجموں کا جو اثر پڑتا رہا ہوگا اس کا ہلکا سا اندازہ کرنے کے لیے میں

---

[1] ہندی ترجمۂ قرآن (پارۂ عم) کے سرورق کی عبارت۔

[2] جائزۂ تراجم قرآنی مرتبہ مولانا محمد سالم قاسمی وغیرہ، مجلس معارف القرآن، دارالسلام دیوبند، ۱۹۶۸ء ص ۱۲۹۔

آپ کے سامنے تیسویں پارے کی دوسری سورۃ کی ابتدائی چند آیتوں کا ترجمہ پیش کرتا ہوں ڈپٹی صاحب کے الفاظ ہیں:

"ان (فرشتوں) کی قسم جو (کافروں کے بدن میں کونے کونے، گھس گھس کر (ان کی جان سختی سے) نکالتے ہیں۔ اور ان (فرشتوں) کی جو (ایمان والوں کی جان ایسی آسانی سے نکالتے ہیں، جیسے بند) کھول دیتے ہیں۔ اور ان (فرشتوں) کی جو (آسمان وزمین کے درمیان) تیرتے پھرتے ہیں۔"

اس ترجمے میں سے اگر قوسین کی تشریحی عبارتیں نکال دی جائیں تو صرف اتنی عبارت رہ جاتی ہے کہ: ان کی قسم جو گھس گھس کر نکالتے ہیں اور ان کی جو کھولتے ہیں اور ان کی جو تیرتے پھرتے ہیں۔" بس یہ ہے ترجمہ بقیہ مفسرین کی سخن فہمی۔

بہر حال انھیں آیات کا ترجمہ خواجہ صاحب نے اس زمانے کی فصیح ہندی میں یوں کیا تھا:

"सौगन्ध है उन (फ़रिश्तो) की जो (काफ़िरों की जान) बड़ी कठिनता से खींचते हैं (अर्थात काफ़िरों की जान निकालने में बड़ा कष्ट होता है) और शपथ है उन (फ़रिश्तों) की जो (मुसलमानों की जान) सहज से निकालते हैं. और शपथ है उन (फ़रिश्तों) की जो आज्ञापालन करने को इस प्रकार इधर उधर फिरते रहते हैं जैसे नदी में हलके-हलके तैरते हैं।

ہندی ترجمے کے علاوہ خواجہ صاحب نے ہندی زبان میں ایک مفصل تفسیر شائع کرنے کا بھی پروگرام بنایا تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایک ماہر ہندی داں کی خدمات بھی حاصل کرلی تھیں، دو سال کے عرصے میں سورۂ بقرہ کی تفسیر مکمل ہوئی لیکن ضخامت

اس قدر بڑھ گئی کہ "مصارف کے پیشِ نظر خواجہ صاحب نے اس کی اشاعت ملتوی کر دی.
اس طرح یہ ابتدائی تفسیر صرف سورۂ بقرہ تک لکھی جا سکی اور وہ بھی ہنوز غیر مطبوعہ"۔[1]

ان دو ترجموں کے علاوہ خواجہ صاحب نے اردو میں ایک اور ترجمہ بھی شائع کیا تھا جسے وہ "لفظی با محاورہ نیا ترجمہ" کہتے تھے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے لکھا تھا:

"میں نے اس ترجمے میں تحت اللفظ ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر با محاورہ رہنے کا خیال بھی رکھا ہے اور یہ بہت زیادہ دشوار اور مشکل کام تھا، کیونکہ کلامِ الٰہی ایسی اعلیٰ عربی زبان ہے جس کی ہمسری ملکِ عرب کے فصیح و بلیغ اہلِ زبان نہ کر سکے تھے عربی زبان میں عموماً اور قرآن مجید میں خصوصاً طرزِ ادا کا ایک خاص انداز ہوتا ہے جس کا ترجمہ ناممکن ہو جاتا ہے۔۔۔۔ الغرض ترجمہ کہیں لفظی ہے کہیں با محاورہ ہے، ایک روش کی پابندی نہیں ہے۔"[2]

اس ترجمے میں خواجہ صاحب نے یہ ندرت کی ہے کہ تحت اللفظ ترجمے کو بین السطور شائع کرنے کے بجائے متنِ قرآن کے چند الفاظ اور ان کے ترجمے کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں لکھا ہے تاکہ ہر ہر لفظ کا ترجمہ ٹھیک اسی لفظ کے نیچے بآسانی معلوم کیا جا سکے۔ انھوں نے ایک جدت یہ بھی کی تھی کہ اردو کے الفاظ پر اعراب لگا دیے تھے تاکہ جو لوگ اچھی طرح اردو نہیں جانتے وہ بھی اعراب کی مدد سے بآسانی ترجمے کو صحتِ تلفظ کے ساتھ پڑھ سکیں۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ خواجہ صاحب نے اس نئے ترجمے میں تفسیروں اور رواجی روایتوں کی تقلید نہیں کی بلکہ جو مطلب قرآن کے الفاظ سے نکلتا ہوا معلوم ہوا وہی اُنھوں نے ترجمے میں ادا کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے پہلے ترجمے کی بھی پروا نہ کی۔ مثلاً ہم اوپر قرآن کی تین آیتوں کا ترجمہ خواجہ صاحب اور ڈپٹی صاحب کی زبان سے سن آئے

---

[1] جائزۂ تراجم قرآنی (مذکورہ بالا) ص ۱۲۳۔

[2] پارۂ عم "قرآن آسان" از خواجہ حسن نظامی مطبوعہ دفتر اخبار منادی ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء ص ۲۶۔

ہیں۔ انھیں تین آیتوں کا ترجمہ شاہ رفیع الدین نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"قسم ہے ان فرشتوں کی کہ زور سے کھینچتے ہیں جان، ڈوب کر، اور قسم ہے ان فرشتوں کی کہ بند کھول دیتے ہیں، جان کا بدن سے بند کھول دینے کر، پھر قسم ہے ان فرشتوں کی کہ جان کو لے کر تیرتے ہیں ہوا میں تیرے کر۔"

نئے ترجمے میں خواجہ صاحب نے شاہ صاحب اور خود اپنے پرانے ترجمے سے اختلاف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں "سورۂ نازعات کی ابتدائی آیات کا ترجمہ سب مترجموں نے اس طرح کیا ہے کہ وہ آیات فرشتوں کے لیے محدود ہوگئی ہیں، مگر مجھے یہ محسوس ہوا کہ چونکہ قرآن مجید قیامت تک کے ہونے والے واقعات کا آئینہ ہے اور اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو قیامت تک پیش آئے گا اس لیے ترجمے میں مترجم کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ آیت کا مطلب محدود نہ ہو جائے۔" [1]

اس طرح جن مذکورہ بالا تین آیات کو مترجمین نے صرف مسلمانوں اور کافروں کی جان کنی کی نقشہ کشی تک محدود کر دیا تھا انھیں خواجہ صاحب نے اپنے نئے ترجمہ میں یوں ادا کیا ہے:

"قسم ہے زور سے کھینچنے والوں کی گہرائی میں ڈوب کر اور قسم ہے آسانی سے کھولنے والوں کی بسہولت اور قسم ہے ہوا میں تیرنے والوں کی لہراتے ہوئے۔"

اسی طرح پانچویں آیت پر جہاں قسموں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اور فرمان ہوتا ہے۔ فالمدبرات امرا" اس آیت کا ترجمہ شاہ صاحب نے کیا ہے۔ "قسم ہے ان فرشتوں کی جو تدبیر کرتے ہیں کام کی"، خواجہ صاحب کا پرانا ترجمہ ہے "پھر قسم ہے ان فرشتوں کی جو حکم کے مطابق امورِ دنیا کا انتظام کرتے ہیں۔"

ان دونوں ترجموں پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ صاحب لکھتے ہیں "ان پانچوں آیات اور ان کے دونوں ترجموں کو پڑھنے سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ دونوں ترجمے کلام الہٰی کو

---

[1] پارۂ عم "قرآن آسان" از خواجہ حسن نظامی مطبوعہ دفتر اخبار منادی، ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء ص ۲۶۔

فرشتوں میں محدود کر دیتے ہیں اور اس کی وجہ سے انسانی ذہن ان کے دوسرے معانی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا جو ان آیات سے نکل سکتے ہیں. مثلاً اگر کوئی شخص ان آیات سے یہ سمجھنا چاہے کہ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ حقائق و معارف نکالنے میں بہت گہرائی میں ڈوب جاتے ہیں اور بعض آسانی سے معانی نکال لیتے ہیں جن کی طرف دوسری آیت میں اشارہ ہے۔ تیسری آیت ہوا میں تیرنے کا ذکر کرتی ہے اس سے ہوائی جہاز کے ہوا میں تیرنے یا آئندہ ہونے والی ایجادوں کا اشارہ بھی نکالا جاسکتا ہے...... پانچویں آیت تو صاف صاف شاہ صاحب اور میرے پرانے ترجمے کے خلاف معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس میں تدبیر امور کا ذکر ہے، یہاں فرشتوں کا نام لینا جس قدر بے جوڑ ہے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کیوں کہ قرآن فرشتوں کے لیے نہیں اترا ہے بلکہ انسانوں کے لیے اُترا ہے اور فرشتوں کو ہماری دنیا کے تدبیر انتظام سے یا ہماری انسانی زندگی سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا ہے اس کو فرشتوں کی قسمیں کھانے اور ان کو اہمیت دینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔"[1]

اس مختصر سے مضمون میں خواجہ صاحب کی خدمتِ قرآنی پر تفصیل سے روشنی ڈالنی ممکن نہیں ہے۔ لیکن اگرچہ چند الفاظ میں ہم اُسے سمیٹنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے مختلف اوقات میں جتنے بھی ترجمے شائع کیے ان میں کوئی نہ کوئی ندرت ضرور رکھی۔ اپنے ترجموں کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لیے ساتھ ہی ساتھ ایسے ترجمے بھی شائع کیے جو اپنی طرز میں ایک دوسرے کے بالکل متضاد تھے۔ رواجی حاشیوں کے بجائے تفسیری تشریحات کو ترجمے کے ساتھ ساتھ قوسین میں دینے کا رواج ڈالا کہ دونوں الگ الگ بھی رہیں اور پڑھنے میں اکتاہٹ بھی نہ ہو۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب انھیں اپنے ترجموں کی خامیاں نظر آئیں اور

---

[1] پارۂ عم "قرآن آسان" از خواجہ حسن نظامی مطبوعہ دفتر اخبار منادی، ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء، ص ۲

انھیں یہ محسوس ہوا کہ مروجہ ترجموں سے قرآن کا مفہوم محدود ہو گیا ہے تو انھوں نے
ایک ایسا ترجمہ بھی شائع کیا جس میں قرآن کے اس دعوے کو پوری طرح سے اجاگر
کرنے کی کوشش کی کہ قرآن ہر ملک اور ہر زمانے کے لوگوں کے لیے ہے اور انسانوں
کی علمی اور ذہنی صلاحیتوں میں جس قدر اضافہ ہوتا جائے گا قرآن کے نئے نئے معانی
ان پر کھلتے چلے جائیں گے۔

ڈاکٹر خلیق انجم

خواجہ حسن نظامی بحیثیت انشاء پرداز

خواجہ حسن نظامی جب تک زندہ رہے، ان کے پڑھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع رہا۔ اہلِ اردو ان کی تحریروں کے ایسے عاشق اور دلدادہ تھے کہ ان کی بعض تصنیفات کے دس دس بارہ بارہ اڈیشن شائع ہوئے۔ لیکن خواجہ صاحب کی وفات کے بعد اُن کے عاشقوں اور مدّاحوں کا حلقہ محدود سے محدود تر ہوتا چلا گیا۔ اور اب یہ حالت ہے کہ ہر اُردو اسکالر، نقّاد اور ادیب خواجہ صاحب کی فنیّ عظمت کا تو قائل ہے۔ لیکن جب پوچھو کہ اس نے خواجہ صاحب کی کتنی کتابیں پڑھی ہیں تو بغلیں جھانکنے لگتا ہے۔ میں یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ آج سے سال ڈیڑھ سال پہلے تک میرا شمار بھی ان بغلیں جھانکنے والے ادیبوں میں تھا۔

یہ مقالہ لکھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک سوال اُبھرا۔ کیا خواجہ صاحب کی تحریریں صرف اُن کے ہم عصروں کے لیے افادیت اور دل چسپی رکھتی تھیں اور کیا آج نئی نسل کے لیے خواجہ صاحب کی تحریروں نے اپنی معنویت کھو دی ہے؟ جس نے بھی خواجہ صاحب کی پانچ سو سے اوپر تصنیفات میں سے صرف تین چار کا بھی مطالعہ کیا ہے، وہ میرے اس خیال سے اتفاق کرے گا کہ خواجہ صاحب کی اگر سب نہیں تو بیشتر تحریروں میں ہر نسل کے لیے دل چسپی کا سامان موجود ہے۔

پھر خواجہ صاحب کی ادیب کی حیثیت سے پہلی جیسی مقبولیت کیوں باقی نہیں

رہی ؟ میرے خیال میں اس کی تین چار وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جس در سے انھیں عظمت اور شہرت ملی تھی، ان کی زندگی بھر کی کمائی اسی در کی نذر ہو گئی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تصوف نے اُنھیں ایک عظیم انسان اور ایک عظیم فن کار بنایا تھا۔ اُن کی وفات کے بعد خواجہ صاحب کے وارثین اور ہم جیسے معتقدین کی تمام تر توجہ خواجہ صاحب کی شخصیت کے مذہبی پہلو پر ایسی مبذول ہوئی کہ ہم ان کی شخصیت کے باقی تمام پہلوؤں کو یکسر فراموش کر بیٹھے۔ ہر سال پابندی کے ساتھ عرس تو منایا جاتا رہا لیکن ان کے ادبی وقار کو برقرار رکھنے کے لیے ہم نے کچھ نہیں کیا۔ میں خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے گزشتہ سال سے خواجہ صاحب پر سمینار کی روایت قائم کی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب جب تک زندہ تھے خود ہی اپنی تصنیفات کی اشاعت کا اہتمام کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی ادبی تصنیفات کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا۔ اگر میں غلط نہیں ہوں تو خواجہ صاحب کے بعد اُن کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی [1] نتیجہ یہ ہوا کہ نئی نسل ان کی تحریروں سے بالکل محروم رہ گئی۔ پھر ہمارے ہاں بڑا شاعر اور بڑا ادیب وہ ہوتا ہے جس کی کتابیں کالج اور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہوتی ہیں۔ چونکہ خواجہ صاحب کی کوئی کتاب نصاب کے نقطۂ نظر سے مرتب نہیں کی گئی، اس لیے وہ نصاب میں شامل نہ ہو سکے۔ کئی یونیورسٹیوں میں طالب علموں نے خواجہ صاحب پر پی ایچ ڈی کا کام شروع کیا۔ لیکن کم سے کم دو طالب علم جنھیں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں اس لیے موضوع بدلنے پر مجبور ہو گئے کہ خواجہ صاحب کی تمام کتابیں کہیں نہیں ملتیں۔

آخری اور سب سے بڑی اور سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ ہر بڑے فن کار کو ہر نئی نسل تک پہنچنے کے لیے ایک ایسے نقاد کی ضرورت ہوتی ہے جو نئی بدلتی ہوئی سماجی

---

[1] خواجہ صاحب کی رحلت کے بعد ان کی متعدد کتابوں کے نئے ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ سی پارۂ دل وغیرہ کے تو ایک سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ (مرتب)

اور ادبی قدروں کے سیاق میں فن کار کو متعارف کراتا ہے۔ جیسے حالی نے غالب کو ایک نئی نسل سے متعارف کرایا اور پھر اس کے بعد کی نسل سے غالب کا تعارف ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے کرایا۔ غالب خوش نصیب ہیں کہ انھیں ہر نسل میں نقاد ملتے رہے۔ خواجہ صاحب کو ابھی تک کوئی ایسا نقاد نصیب نہیں ہوا ہے۔

ہم سب خواجہ صاحب کے مجرم ہیں اور اپنے جرم کی تلافی صرف اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ ایک ایسی لائبریری بنائیں جس میں خواجہ صاحب کی ہر کتاب اور ہر تحریر محفوظ ہو۔ تاکہ جب کوئی خواجہ صاحب پر کام کرے تو اسے تمام چیزیں یک جا مل جائیں۔ اُن کی ہر کتاب کا شائع کرنا فی الحال ممکن نہیں لیکن بعض اہم کتابیں اور اُن کی بعض تحریروں کے انتخابات شائع کرنا ضروری ہے۔

ایک ایسا ٹرسٹ بنایا جائے جو خواجہ صاحب پر کام کرنے والوں کو وظیفے دے یا ان کی مالی مدد کرے۔

میں آج خواجہ صاحب کی جن تحریروں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں وہ منادی اور کائنات بیتی میں شائع ہوئی تھیں۔ ان مضامین میں خاکے اور انشائیے دونوں شامل ہیں۔

ان نثر پاروں کی سب سے بڑی خوبی ان کا اسلوب بیان ہے۔ ان میں سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی ہے۔ تکلف اور آورد کا نام و نشان تک نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بیٹھا اپنے دوستوں سے بے تکلف باتیں کر رہا ہے۔ اردو میں دو نثر نگاروں کی تحریر کا یہ وصف ہے۔ ایک غالب اور دوسرے خواجہ صاحب۔ غالب نے یہ کمال اردو خطوط میں دکھایا ہے۔ خطوط میں کوئی ایک شخص مخاطب ہوتا ہے اور مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی ذات سے متعلق کچھ ایسے واقعات ہوتے ہیں جو موضوعِ سخن بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس انشائیے میں مخاطب ایک نہیں سینکڑوں اور ہزاروں آدمی ہوتے ہیں اور موضوع ایسا ہوتا ہے جس میں صرف مضمون نگار کے علم، تخیل آفرینی اور جدت اور طرزِ بیان کو دخل ہوتا ہے اور پھر غالب کے مکتوب الیہ پڑھے

لکھے اور سمجھدار لوگ ہیں۔ اس کے برعکس خواجہ صاحب جن لوگوں سے خطاب کرتے ہیں اُن میں بہت پڑھے لکھے، کم پڑھے لکھے اور بہت کم پڑھے لکھے غرض ہر ذہنی سطح کے لوگ شامل ہیں۔ اس لیے اُنھوں نے ایک ایسا اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے جو ہر ذہنی سطح کے آدمی کے لیے دل کشی رکھتا ہے۔

خواجہ صاحب کا اسلوبِ بیان سر سید احمد اور محمد حسین آزاد کے اسالیب کی درمیانی چیز ہے۔ اس میں سر سید کی سادگی اور سلاست اور محمد حسین آزاد کی شگفتہ بیانی اور سجیلا پن ہے۔ سر سید کی طرح خواجہ صاحب کی نثر بہت صاف اور سادہ ہے لیکن وہ تشبیہات اور استعارات کے سہارے نثر کو بہت خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ یہاں ایک بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ خواجہ صاحب محمد حسین آزاد کی طرح شاعری کی تشبیہات اور استعارات نثر میں استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی زندگی سے سچی اور کھری تشبیہات کا انتخاب کرتے ہیں۔ آزاد یقیناً صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں۔ لیکن ان کی نثر میں جو معنی آفرینی، رنگینی اور شعریت ہے وہ شاعری اور خاص طور پر "غزل" سے مستعار ہے۔ اس کے برعکس خواجہ صاحب جو لکھتے ہیں وہ نثر اور صرف نثر ہوتی ہے۔ ان کی مرقع کشی میں جو تشبیہات استعمال ہوئی ہیں وہ اردو کی روایتی تشبیہات نہیں بلکہ خواجہ صاحب کی اپنی زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ دیکھیے ماڈرن معشوق کا نقشہ کن الفاظ میں کھینچا ہے:

"قد ایسا جیسا اخبار کا کالم۔ بال ایسے جیسے تنخواہوں کی تخفیف۔ پیشانی ایسی جیسے وہائٹ پیپر۔ بھویں ایسی جیسے اسمبلی ہال۔ پلکیں، لکھنے کا باریک نب۔ آنکھیں الکشا نیز ذن کے ننھے ننھے دو گلاس۔ نگاہیں کنزرویٹو گورنمنٹ کی پالیسی۔ رخسار بالشویک پارٹی کی سرخ پوشی، ٹھوڑی برٹش ڈپلومیسی۔ ہونٹ انگریزی کمانے کی لال جیبی۔ کمر ہندوستان کا اتفاق۔ باتوں کی کتر شیانے کی جیسے یہ اتنا رہ جیسے پولیس کا سپاہی۔ ایسا بے وفا جیسے دیسی لیڈر۔ ایسا ہرجائی جیسے تباکو۔ ایسا منہ چڑھا جیسے چار کی پید

چلتا ہے تو سگرٹ کے دھوئیں کی طرح بل کھاتا ہوا۔ دیکھتا ہے تو خوردبین بن جاتا ہے۔ بولتا ہے تو پیانو معلوم ہوتا ہے۔"

اس مختصر سے نثر پارے میں کیا کچھ نہیں ہے؟ گرد و پیش کی زندگی کا غیر معمولی علم، تخیل کی بلند پروازی، حسنِ انتخاب، شگفتگی، طنز، مزاح، ہم عصر زندگی کے سماجی حالات پر تبصرہ۔

خواجہ صاحب دلّی کے دبستانِ نثر کے سب سے اہم اور بڑے نمائندے ہیں۔ انھیں اردو زبان پر بھرپور قدرت ہے۔ اپنے مفہوم کی ادائیگی کے لیے انھیں عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور اردو فارسی کے اشعار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ زبان پر عبور۔ علم۔ اور قوتِ مشاہدہ۔ ان تین عناصر کے بل پر انھوں نے بہترین نثر لکھی ہے۔

کسی ایسے مسلمان سے ناراض ہیں جو مسلم دشمن ہے۔ جو غالباً سرکاری ملازم ہے اور جس کی ہمدردیاں برٹش گورنمنٹ کے ساتھ ہیں۔ خاکے کا عنوان ہے "نئی روشنی کا فرعون۔" دیکھیے ان کی جدتِ فکر نے کیسے کیسے ہیرے تراشے ہیں:

"ٹھنگنا قد جیسے ورزش کا مگدر۔ موٹا بدن جیسے ڈنلاپ ٹائر کی اشتہاری تصویر۔ رنگ نہ گورا نہ کالا۔ نہ گندمی نہ سانولا۔ نہ پھیکا نہ میٹھا نہ کڑوا نہ کسیلا بلکہ کالے سفید تلوں کی ملی ہوئی بھوسی کی رنگت ہے۔ چہرہ سلولائیٹ ساخت کے کھلونوں سے مشابہ ہے۔ نہ گول نہ کتابی دیکھنے میں انسانی صورت ہے مگر فرشتوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی نہیں بلکہ شدّاد نے اپنی بہشت بناتے وقت کسی کمہار سے بنوائی ہوگی۔ آنکھیں مگرمچھ کی طرح چھوٹی چھوٹی نیچے کی طرف جھکی ہوئی۔"

اسے جزئیات نگاری کہتے ہیں اور یہ غیر معمولی قوتِ مشاہدہ کے بغیر ممکن نہیں۔ ان تشبیہات سے ہندوستان کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ کیوں کہ یہ سو فی صد ہندوستانی تشبیہات ہیں۔ ان خاکوں کی بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ خواجہ صاحب انتہائی اختصار اور ایجاز سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے لوگ سو صفحے لکھ کر وہ تاثیر پیدا نہیں کر سکتے جو خواجہ صاحب

ایک ڈیڑھ صفحے کے خاکے میں کر دیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ شخصیت کے صرف اُن چند پہلوؤں کا انتخاب کرتے ہیں جو اسے عام انسانوں سے مختلف بناتے ہیں۔

خواجہ صاحب کے موضوعات میں اتنا تنوع ہے کہ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو میں کسی نثر نگار نے اتنے مختلف موضوعات پر نہیں لکھا۔ سیاسی، سماجی، اخلاقی، فلسفیانہ مسائل سے لے کر چھوٹی چھوٹی چیزیں تک ان کا موضوع ہوتی ہیں۔ انھیں زندگی سے بے پناہ محبت ہے۔ اپنے گردو پیش کی ہر چیز سے وہ پیار کرتے ہیں۔ وہ عالم تھے۔ اس لیے ان کا علم وسیع تھا۔ آنکھیں اور دماغ کھلا رکھتے تھے اس لیے مشاہدہ غیر معمولی تھا۔ وہ گوشہ نشین نہیں تھے۔ بلکہ خدا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے والے تھے اس لیے ان کا تجربہ بے پناہ تھا۔ اب ذرا ان کے موضوعات کا تنوع ملاحظہ ہو:

تاریخی شخصیتوں میں چنگیز خاں، ابولہب، ابوجہل، قارون، فرعون، نمرود اور نوح وغیرہ

غیر مسلم مذہبی شخصیتوں میں رام، سیتا، رادھا، کرشن، حضرت عیسیٰؑ [1] گورونانک وغیرہ

آلاتِ حرب میں تلوار، تیر، کمان، خنجر، ڈھال، بندوق، پستول وغیرہ۔

جدید سائنس کی ایجادات میں ٹیلی فون، بجلی، لفٹ، ریل کے خطرے کی زنجیر، ٹرام تار برقی وغیرہ۔

ذاتی چیزوں میں چادر، لوٹا، لحاف، آبخورہ، بھینس، ہاتھ کی بید، قلم، موٹر وغیرہ۔

عام چیزوں میں درانتی، کٹی کاٹنے کی مشین، کھرپا، ہل کی پھالی، گھانس کاٹنے کی قینچی، سوئی، سلائی کی مشین، رندہ، آری وغیرہ۔

سیاسی رہنما، مختلف فنون کے فن کار، سرکاری ملازم، دوست، رشتہ دار، ملازم وغیرہ۔

خواجہ صاحب نے مختلف مذاہب اور مختلف صوبوں کے لوگوں کی خصوصیات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے ہندو مسلمان، سکھ، یو۔پی والے پنجابی اور دلی والے جیسے موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔

---

[1] اسلامی عقیدے سے حضرت عیسیٰؑ کو غیر مسلم نہیں کہا جاسکتا۔ (مرتب)

ان موضوعات کو دیکھ کر ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ خواجہ صاحب کے مخاطب عوام تھے۔ نظیر اکبر آبادی کی طرح وہ بھی خواص سے زیادہ عوام میں رہنا پسند کرتے تھے۔ اسی لیے اُن کی دل چسپی کی چیزوں کو اپنا موضوع بناتے تھے۔

خواجہ صاحب قلم کے سچے تھے۔ کبھی کسی مصلحت سے مجبور ہو کر حق اور صداقت سے روگردانی نہ کرتے۔ وہ ہر شخص کے بارے میں بہت سوچ سمجھ کر اپنی رائے بناتے۔ اور پھر نتائج کی پروا کیے بغیر بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کر دیتے۔ ان کی بے باکی اور حق گوئی، کئی بڑے معرکوں کا سبب بنی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بھک سے اڑ جانے والی ایک قسم کی انسانی بارود ہیں ان کی بول چال میں تحریر میں پنجابی اثر مطلق نہیں ہوتا۔ مگر ان کی اردو عرب سے بن کر آتی ہے اور فارس کے راستے یہاں پہنچتی ہے۔"

سر سکندر حیات خاں کے بارے میں ان کی رائے ملاحظہ ہو:

"میں انگریز ہوتا تو ان کو وائسرائے بنا دیتا اور اپنی سوسائٹی سے کہتا کہ دیکھو میری حکمت کہ نام ہندوستانی کا ہے مگر کام میری قوم کا ہو رہا ہے۔"

وہ نفع اور نقصان کی پروا کیے بغیر سرکاری افسران کے متعلق جو محسوس کرتے تھے لکھ دیا کرتے تھے۔ کسی ہندوستانی، سرکاری افسر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"انگریز سرکار کے عشق میں قیس عامری ہیں۔ فرق یہ ہے کہ قیس کو عشق بے نتیجہ نے لاغر کر دیا تھا اور یہ نتیجہ خیز سبب سے فربہ ہو گئے ہیں کہ جس رخ سے دیکھو مساوی نظر آتے ہیں۔"

خواجہ صاحب کو ہر فن سے عشق تھا۔ اس معاملے میں وہ بہت آزاد خیال تھے۔ دہلی کے سید عبدالمتین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"انھوں نے یورپ میں فلم کا کام سیکھا ہے اور ہندوستان میں بھی یہ کام کیا ہے۔ مگر اب وہ اسے ظاہر کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔ میں نے کہا یہ ایک فن ہے اور مسلمانوں کو حریف قوموں کے فلمی حملوں سے بچانے کے لیے

میں خود فلموں میں کام کر کے اس کا دروازہ کھول دینا چاہتا ہوں۔"
آغا حشر کاشمیری کے متعلق لکھا ہے۔ اور یہ بات خواجہ صاحب ہی لکھ سکتے تھے:

"آنے والے ہندوستانی ان کو شکسپیئر سے زیادہ اونچے درجے پر بٹھائیں گے لیکن ایسا کرنے والے ہندو ہوں گے۔ کیوں کہ مسلمان تو یہی سوچتے رہ جائیں گے کہ ڈرامہ نویس کی عزت اور قدر کرنی جائز بھی ہے یا نہیں۔"

خواجہ صاحب فن کاروں کے قدر داں تھے۔ انھوں نے بعض فلم ایکٹریسوں کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اداکاری کے فن پر اُن کی گہری تنقیدی نظر تھی۔ کجن کے فن پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کی ایکٹنگ میں شوخی و شرارت نہیں ہے۔ بلکہ ایک وقار اور مصنوعی متانت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی رفتار اور گفتار میں ایک سلیقہ اور تمیز ہے۔"

سلوچنا کا مرقع ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"میانہ قد، خوب گوری، گداز بدن، چہرہ کتابی، آنکھیں رسیلی، کالی پتلی والی اور بڑی بڑی۔"

اس کے حسن کی داد ان الفاظ میں دیتے ہیں:

"وہ انکم ٹیکس لگانے کے قابل ایک دولت ہے اور نیلام کرنے اور شراب فروشوں کو ٹھیکے پر دینے کے لائق دیسی شراب ہے۔ وہ مجسم جوا ہے، ایسا جوا جہاں ہار کے سوا جیت کبھی نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسی قانون شکنی ہے جس کی روک تھام کے لیے کوئی آرڈی نینس نہیں بن سکتا۔"

خواجہ صاحب کا زمانہ وہ ہے جب مذہب کے نام پر فرقہ پرستی کے شعلوں نے اچھے سے اچھے صاف ذہنوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ خواجہ صاحب کبھی ان شعلوں کی زد میں نہیں آئے۔ کیوں کہ انھیں ورثے میں ہندوستان کے عظیم ترین صوفیائے کرام کی وسیع المشربی، انسان دوستی اور رواداری ملی تھی۔ اپنی تحریروں کے ذریعے وہ مذہب کے نام پر جلائی ہوئی آگ کو بجھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ لیکن ان کی آواز ہندوستان

کی کروڑوں کی آبادی میں ایک مخصوص حلقے تک پہنچ سکتی تھی اور اس حلقے کی حد تک وہ کامیاب رہے۔ وہ دوسرے مذاہب اور اُن کے پیشواؤں کا دل سے احترام کرتے تھے۔ اور اپنی تحریروں کے ذریعے عقیدت کے پھول نچھاور کرتے تھے۔

گرونانک جی کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"سچے خدا کا سچا ولی۔ توحید کا سمندر۔ حقانیت کا طوطیِ ہزار داستان پانچ دریاؤں کے ملک میں حواس خمسہ کو شیریں گفتار سے درسِ وحدت دینے والا۔ سکھ فرقے کا بانی۔ مگر فرقہ پرستی سے پاک۔"

کرشن جی کے خاکے کے اختتامیہ الفاظ ملاحظہ ہوں :

"رسیلی آنکھ والے۔ نظر اُٹھا۔ اور نگاہ کا ایک تیر اپنے داس کو دے کہ وہ بے تابانہ پکارتا ہے۔ اک تیر پھینکتا جا بانکی کمان والے۔"

انسان دوستی خواجہ صاحب کا مذہب تھا۔ اُنھوں نے جو کچھ سوچا اور جو کچھ لکھا وہ کسی ایک مذہب یا کسی ایک طبقے کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ ہر انسان کے لیے ہے۔

سید حامد

گنگا جمنی طلسم

نفسیات کی ایک اصطلاح ہے **SUBLIMATION** مولوی عبدالحق نے جس کا مترادف "تہذیب"، "تصعید" اور "ارتفاع" کو ٹھہرایا ہے۔ اس اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ ارادے اور کوشش سے کسی جذبے یا قوت کو ادنیٰ سے اعلیٰ میں بدلنا۔ تہذیب اور انسانی ترقی بڑی حد تک اسی عملِ ارتفاع کی رہین منت ہے۔ فرد کی شخصیت کو یہ عمل نہ صرف بلندی بلکہ تموّل اور کشش بھی عطا کرتا ہے۔ شخصیت جس قدر تہہ دار ہو اسی قدر اس عمل ارتفاع سے بہرہ مند نظر آئے گی۔ اس عمل کی ایک نشانی تناؤ یا داخلی کشمکش ہے یا وہ کیفیت جسے گنگا جمنی کہتے ہیں۔ جمنا کے تٹ کے باسی خواجہ حسن نظامی کی شخصیت اور ان کے اندازِ بیان میں وہ گنگا جمنی کیفیت جلوہ گر ہے جس پر لغوی طور پر دلّی کے بجائے پریاگ کا حق زیادہ ہے۔ لیکن پریاگ سے خواجہ صاحب کا رشتہ کم استوار نہیں تھا۔ اکبر الہ آبادی سے جو تعلقِ خاطر انھیں تھا اور جس قدر احترام وہ ان کا کرتے تھے وہ مشاہیر کے باہمی روابط کا ایک دلکش باب ہے اور پریاگ سے تعلق کا ایک عنوان تیرتھوں کی وہ یاترا بھی تھی جس پر خواجہ حسن نظامی کفن سر سے باندھ کر نکلے۔ مقلّد کی اس بدعت پر کوئی کم لے دے نہیں ہوئی۔

لیکن خواجہ صاحب کو مقلّد کیوں کہیے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں بارہا اس بات کا اعلان کیا ہے کہ وہ مزاجاً تقلید سے نفور تھے۔ انھیں پیہم نئی راہیں نکالنے کی جستجو

رہتی۔ ملا واحدی نے سی پارۂ دل کے دیباچے میں بہت پتے کی بات لکھی ہے کہ:

"خواجہ صاحب مقلد ہیں اور حنفی مشرب رکھتے ہیں لیکن انشاپردازی میں تقلید سے ان کو اتنی ہی چڑ ہے۔ خواجہ صاحب نے اردو میں جو نئی راہ نکالی ہے، جس کا ہر انشاپرداز کو اقرار ہے، اس کا راز یہی غیر مقلدی ہے۔ ایک بات کسی شخص نے ایک پیرائے سے بیان کی اور خواجہ صاحب کو منظور ہوا کہ اس کی تائید کریں تو وہ کبھی اس کے بیان کردہ پیرائے کی نقل نہیں کریں گے بلکہ ایک ایسے انداز کی تلاش میں رہیں گے جو سابق لکھنے والے سے علیحدہ ہو، اور بالکل ایک نئی مستقل بات بن جائے۔ اس کوشش میں وہ ہفتوں مصروف رہتے اور مضمون نہیں لکھتے جب تک جدت ان کے قبضے میں نہ آجائے۔"

اس وصف سے اندازہ ہوتا ہے خواجہ صاحب کی مضبوط اور نمایاں انفرادیت کا، یہ کشیدہ قامت انسان ہر مجمع میں سربلند رہنا چاہتا تھا خواہ وہ عام انسانوں کا مجمع ہو، خواہ اہلِ طریقت کا، خواہ انشاپردازوں کا۔ اسد اللہ خاں غالب کی طرح خواجہ حسن نظامی کو روشِ عام سے شدید انحراف تھا۔ ظاہر ہے غالب کے تخیل تک ہمارے نثر نگار کی رسائی کہاں ہوتی، لیکن خواجہ حسن نظامی کی تحریر میں جابجا اس دلکش ندرت کا چہرہ جھلکتا ہے جو تخیل کی کنیز ہے۔ خواجہ صاحب کی سادہ اور سلیس اور بہ ظاہر پیادہ روِشِ ذرا کھرچ کر اور ٹٹول کر دیکھیے تو شعری اور تخیلی عناصر سے مالامال نظر آئے گی۔ ان میں سے ایک چھوٹے سے عنصر کا مشاہدہ اس اقتباس میں کیجیے، روزنامچہ سفرنامہ میں مصری عورتوں کے متعلق لکھتے ہیں:

"مصری عورتیں منہ پر ایک سیاہ کپڑا باندھ لیتی ہیں جس میں تھوڑی سی ناک بھی ڈھکی رہتی ہے۔ باقی آنکھوں اور ان کے نیچے اوپر کے حصے کو نشانہ بازی کے لیے کھلا رکھتی ہیں۔ یہ سیاہ کپڑا اس قدر باریک ہوتا ہے کہ ہونٹوں کی سرخی صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ گویا دکھاتی ہیں کہ پتلے بادلوں میں چاند ایسا ہوتا ہے اور آسمان میں پاند ایسا ہوتا ہے اور آسمان میں چاند

کی بہار دیکھتی ہو تو ذرا نگاہ تھوڑی سی اور اوپر کر لو اور دیکھ لو۔

آنکھیں ایک تو ہوتی ہی ہیں عموماً سیاہ، اُس پر سرمے کی سان پلکوں کی نوک کو اور تیز کر دیتی ہے۔ اندر ایک سایہ سا ہوتا ہے جس کے اوپر سیاہ ریشمی چادر۔ چلتی ہیں تو ڈھلکتی ہوئی چادر کو دانستہ پھسلاتی ہوئی اور بناوٹی گھبراہٹ سے اِدھر اُدھر دیکھ کر اُسے سمیٹتی ہوئی۔ نوجوان اس تماشے کی آرزو میں جگہ جگہ بنچوں پر موجود رہتے ہیں۔

سبز گھاس پر جا کر تو ان کی اٹھکیلیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں۔ دوڑتی ہیں۔ ایک دوسرے سے اُلجھتی ہیں، ہنستی ہیں اور زمین کی طرف جھکی پڑتی ہیں گویا نشے میں بے قابو ہیں، یا گھاس کترنے کی قینچی ہیں جس کو یورپ کا تمدن چلا رہا ہے اور گھاس کے ساتھ ایمان اور تقدس کے بے خطا پودوں کو بھی کترتا چلا جاتا ہے۔"

غور کیجیے اس مختصر سی عبارت میں کشش اور انحراف، مشاہدہ اور تخیل، نیم ستائش اور تبرا، حسن شناسی اور زہد، صنم آشنائی اور تورع کے تصادم نے گنگا جمنی بوقلمونی طلسم تیار کر دیا ہے۔ یہ عبارت اس عملِ ارتفاع کی نشاندہی بھی کرتی ہے جس کا ذکر میں نے آغازِ داستان میں کیا تھا۔ یہی عملِ ارتفاع دراصل تصوف کا سنگِ بنیاد ہے۔ یعنی مجاز سے حقیقت کی طرف سفر، اسے ہی طریقت کہتے ہیں۔ سفلی جذبے کو علوی بنانا۔ حیوانی طاقتوں پر انکش لگانا۔ جذبات اور رجحانات کو فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچا دینا۔ تہذیب اور انسانی تسخیرات اسی عملِ ارتفاع سے عبارت ہیں۔ اس عملِ ارتفاع کو سب سے خوبصورت خراج اقبال نے اپنی اس نظم میں ادا کیا ہے جو انسان اور یزداں کے درمیان مکالمے کے روپ میں ہے:

بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

اس تحریر میں اس جملے کی طرف بھی نگاہ دیجیے۔ "گھاس کے ساتھ ایمان اور تقدس کے بے خطا پودوں کو بھی کترتا چلا جاتا ہے۔" "بے خطا" کی خاموش ترکیب کس قدر

بلیغ ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی سہل ممتنع سادہ رواں دواں نثر میں اس قسم کی چونکا دینے والی تراکیب ہر موڑ پر مل جائیں گی۔ علاوہ بریں آخری جملے میں وہ انداز ہے جسے قصیدے کی اصطلاح میں "گریز" کہیں گے۔

"گل بانو" کا ذکر "کانا باتی" میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں "سولھویں سال میں قدم رکھا تو شباب نے بچپن کی ضد اور شرارتیں تو رخصت کر دیں مگر دل ربائی کی شوخیاں اس قدر بڑھا دیں کہ محل کا بچہ بچہ گل بانو سے پناہ مانگتا تھا۔ گل بانو سنہری چھپر کھٹ میں دو شالہ تانے سویا کرتی تھیں۔ شام کو چراغ جلے اور بانو کو نیند آئی اور سیدھی چھپر کھٹ میں پہنچیں۔ ماں کہتی "چراغ میں بتی پڑی اور لاڈو پلنگ چڑھی" تو گل بانو مسکراتی اور جمائی لے کر سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو ماتھے سے سمیٹ کر کہتی۔ "اچھا بی تم کو کیا؛ سوتے ہیں وقت کھوتے ہیں تمھارا کیا لیتے ہیں۔ تم ناحق کوئلوں پر لوٹ جاتی ہو۔"

غور کیجیے، ایک شہزادی کے الھڑ اور ناز پروردہ شباب کی رعنائیوں کی تصویر کشی ہمارے صوفی انشا پرداز نے کس خوبی کے ساتھ کی ہے۔ یہ بھی مدِ نظر رہے کہ تصویر کشی صرف تصویر کشی کے لیے نہیں ہے۔ فن کار نے ایک تصویر آغازِ داستان میں کھینچ کر رکھ دی۔ یہ تصویر کھینچتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں اس دوسری تصویر کا خاکہ تھا جس پر یہ کہانی ختم ہوئی۔

"درگاہ حضرت چراغ دہلی کے ایک کونے میں ایک قبول صورت عورت پھٹا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت خاک کے بستر پر پڑی ہائے ہائے کر رہی تھی..... تیز ہوا کے جھونکوں سے بارش کی بوچھار اس جگہ کو تر کر رہی تھی جہاں یہ عورت نمونیے کے سخت بخار میں بے ہوش لیٹی تھی۔" یہ انجام اس ناز پروردہ حسین شہزادی کا ہوا جو کبھی لال قلعے کی جان تھی اور بادشاہ کی آنکھوں کا تارا۔ مصنف نے لیل و نہار کی اس گردش پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ صرف تصویروں کو گویائی عطا کر دی۔ تقابل اور تضاد، توازن اور تناسب سے تاثیر کی تعمیر میں حسب دل خواہ مدد لی پھر بھی اسلوب کی سادگی کے دامن پر تصنع اور تکلف کے چھینٹے نہیں پڑنے دیے۔ اس پہلو کی طرف قارئین کرام کا دھیان

اس لیے دلایا گیا کہ خواجہ حسن نظامی کی زود نویسی پُر نویسی اور زیاد نویسی اور طرزِ بیان کی ظاہری سادگی پر نہ جائیں۔ ان کی عبارت کی تشکیل فن کاری کے اصولوں پر ہوئی ہے۔ ایک سطح تو ان کی تحریر کی وہ ہے جو ہر خاص و عام کو لبھاتی ہے۔ یعنی سادہ، سلیس، ستھری، خوبصورت، البیلی اور با محاورہ زبان، وہ زبان جس کے غیر معمولی صوتی حسن کا اندازہ ان سطور سے بخوبی ہو گیا ہو گا جنھیں میں نے دہرایا ہے۔ دوسری سطح وہ ہے جس میں نگاہِ حروف بیں کو لعل و جواہر ملتے ہیں، جہاں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آمد کتنی بڑی ریاضت، کتنے طویل اور مختلف النوع تتبع کا ثمر ہے اور کسی عظیم اور خود ساختہ شخصیت کے ان تھک جتن اور آہنی عزم کا مظہر اور لبّ لباب ہے۔ لیکن یہ پیروی نقالی نہیں تسخیر ہے۔ ہماری ادب نوازی کا ایک دور تھا۔ جب ہر اہلِ قلم پر کوئی لیبل لگا دیا جاتا تھا۔ مثلاً علامہ راشد الخیری مصورِ غم، خواجہ حسن نظامی مصورِ فطرت، حسرت موہانی رئیس المتغزلین۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ نازیبا رسم اب متروک ہو گئی۔ وہ اہلِ قلم یقیناً تہی مایہ ہو گا، ایک لیبل جس کی شخصیت اور تحریر کا حق ادا کر دے۔ اہلِ قلم کے امام شیکسپیئر پر نگاہ ڈالیے۔ ہر نصف صدی اس کے آثار کے نئے نئے پہلوؤں کو مرہونِ انکشاف کرتی چلی آئی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کو مصورِ فطرت کہہ کر مطمئن ہو جانے سے کام نہیں چلے گا۔ اُن کی شخصیت کی طرح اُن کی نگارش بھی متمول اور تہہ دار ہے۔ صلح کا پیامی اور تصوف کا یہ مبلغ شطرنج کا ایک ماہر کھلاڑی بھی تھا۔ شطرنج وہ اسی اہتمام کے ساتھ اور اسی طرح ہمہ تن استغراق ہو کر کھیلتا تھا جیسے لڑائی لڑی جاتی ہے۔ بساط کے ایک طرف وہ تھا اور دوسری طرف قارئین، جنھیں اپنے بے خطا اور بے ضرر حربوں سے دام میں گرفتار کر کے ہی وہ دم لیتا تھا۔

اس کی نامعلوم سطح کے نیچے ان گنت چالیں چھپی ہوئی ہیں۔ قیاس کیجیے بحری سفر کی ڈائری سے چنی ہوئی ان سطور کی بنا پر:

"جی گھبرایا تو چھتری پر چلا گیا۔ ایک پارسی ایک فرانسیسی سے شطرنج کھیل رہا تھا پارسی کے مہرے سیاہ تھے، فرانسیسی کے سفید۔ میں نے دیکھا کہ سفید مہرے سیاہ مہروں پر چھائے جاتے ہیں۔ بے ساختہ کہہ اُٹھا فرزیں کو بچا دو۔ فرانسیسی فارسی جانتا تھا،

بولا آپ آیئے۔ میں دس برس سے شطرنج کا تارک' ذرا ہچکچایا مگر فرانسیسی نے اصرار کیا مجبوراً مقابلے میں اترنا پڑا۔

میدان ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بساط میں کامل ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں تھا۔ لشکر بے قاعدگی سے حرکت کر رہا تھا اور حریف بڑی دانائی سے مورچوں پر چھایا ہوا چلا آتا تھا۔ میں نے "الحرب خدعۃ" پر عمل کیا۔ دانستہ رُخ کو پیدل کے منہ میں دے دیا۔ فرانسیسی نے رخ کو مار لیا اور مجھ کو ناتجربہ کار سمجھ کر مطمئن ہوگیا۔ غنیم کا شاہ میسرہ کے قلعے میں بالکل محفوظ تھا۔ میں نے میمنہ کی طرف اپنا لشکر بڑھایا تاکہ حریف ادھر جھکے اور میسرہ کا قلعہ ٹوٹ جائے جوں ہی میمنہ کی جانب میری یورش دیکھی حریف اپنے سب مہروں کو ترتیب کے ساتھ نکالتا ہوا اُدھر جھک آیا اور قلعۂ شاہی میں چند رخنے پڑ گئے۔ یہی میں چاہتا تھا۔ فوراً دو گھوڑے معرکے سے جدا کیے اور انھیں شاہ کی طرف جھونک دیا۔ اب دشمن سمجھا اور غضب ناک ہو کر قلعے کی طرف پلٹا مگر یہاں کام ہو چکا تھا گھوڑے فصیل کود کر شاہ کو محاصرے میں لے چکے تھے اور پیدل کی ایک چال پر قسمت کا فیصلہ رہ گیا تھا۔ حریف سے اور چال بن نہ آئی فرزیں کو قربان گاہ بھیج دیا...... پیدل نے آگے بڑھ کر شہ دی فرانسیسی مات کھا گیا"

پیرایۂ بیان کی دل کشی کے علاوہ آپ نے صاحبِ تحریر کی حکمتِ عملی اور مبارزہ طلبی اور نبرد آزمائی اور داؤ پیچ کے تیور بھی دیکھے ہیں۔ فرانسیسی شاطر کی طرح ہنر وسنا ناقد قاری ہمارے انشاپرداز کے اسلوب کی ظاہری سادگی سے مات کھاتا چلا آرہا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی فن کاری کا تنقید اور تحقیق پر دیرینہ قرض ہے۔ دیکھیے کب یہ چکایا جاتا ہے۔ ریسرچ کے لیے نہ معلوم کتنی راہیں ان پانچ سو کتابوں اور کتابچوں سے نکل سکتی ہیں جو اردو ادب کو خواجہ کی دین ہیں۔ سامنے کی بات ان اہلِ قلم کی کھوج ہے خواجہ صاحب نے جن سے فیض اخذ کیا۔ عبدالحلیم شرر اور محمد حسین آزاد سے استفاضے کے خواجہ صاحب خود معترف تھے۔ لیکن ان کے تانے کے ساتھ ساتھ بے شمار دوسرے بانے بھی گتھے ہوئے ہیں لیکن انہ زنتالی کا نہیں فتح مندی کا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ سعدی شیرازی اور میر من دہلوی

کے پیرایۂ بیان کا بھی خواجہ صاحب کے اسلوب پر نمایاں اثر ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے آثار کی مقبولیت، دیرپائی اور توانائی کا ایک بڑا راز ان کا مشاہدہ اور ان کی ارضیت ہے۔ جس صوفی صافی کا فلک سیر تخیل عرش کی خبر لاتا تھا وہ خود زمین پہ پیر گاڑے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کی ایک آنکھ ارض پر تھی اور دوسری عرش پر۔ چنانچہ مضمون کتنا ہی متصوفانہ مابعد الطبیعاتی ہو، وہ اس کا رشتہ ارضی تشبیہات اور عام انسان کے مشاہدات اور تجربات سے جوڑتا تھا۔ اس لیے جو بات وہ کہتا تھا وہ دل نشین ہو جاتی تھی۔ اس امر میں اس حد تک اردو کا کوئی اہلِ قلم اس کا حریف نہیں ہے۔

مشاہدے کی ایک چھوٹی سی مثال سُنیے۔ نقشہ چتوڑ کے ریلوے اسٹیشن کا ہے:۔

"ایک میلا کچیلا حلوائی جس نے دھوتی کے پچھلے حصّے کو اس بدسلیقگی سے اڑسا تھا کہ آدھے گز کے قریب کپڑے کا گُچھا دُم کی مانند اوپر نکلا ہوا تھا حلوائی چلنے میں نیچے کے جسم کو اس طرح حرکت دیتا تھا کہ وہ کپڑے کا گچھا گت بھرتا معلوم ہوتا تھا۔" ایسا مشاہدہ عرفِ عام میں صرف کسی ممتاز ناول نگار یا فسانہ نویس سے منسوب کیا جا سکتا ہے

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے مزار پر جا کر ہمارے کلیم الانبیا نے ان سے جو گفتگو کی اس میں تشبیہ کی اس مثال پر غور کیجیے جو خواجہ حسن نظامی کی تقریر و تحریر کی دل پذیری کا ایک وسیلہ ہے اور جس کا منبع مشاہدے کی باریکی اور تجربے کی وسعت میں ملے گا۔ "اے مقدس باپ۔ اب نبوی تجلّی کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ پروردگار سے کہیے کہ وہ آپ کے اس دین کو محفوظ کر دے جس میں صرف رسم ختنہ اور قربانی کے سوا کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ اسلامی رجسٹری کے لفافے پر ابراہیمی مہریں سالم ہیں لیکن اندر کے قیمتی نوٹ غائب ہو گئے۔"

مشاہدے کا ایک اور موتی مرقدِ بلال کے بیان سے تعلق رکھتا ہے۔ سُنیے۔ "جوں ہی مرقدِ بلال پر نگاہ پڑی آنسو سامنے آ گئے اور پلکوں کو ہلانے لگے۔"

مشاہدہ تشبیہ اور تمثیل کا قریبی رشتہ دار وہ ڈرامائی انداز ہے جو خواجہ صاحب کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس میں تصوّر بھی ہے تجسیم بھی خطابت بھی ہے اور تعلیم بھی۔ مراقبہ بھی ہے مکالمہ بھی، تعبیر بھی ہے تاثیر بھی۔

"اٹھو بلال اٹھو بابا جان تک لے چلو، جاگو بلال جاگو اذان کا وقت ہوگیا۔ میں تمہاری چادر کھینچ لوں گا۔ میں تمہارے پاؤں میں گدگدیاں کروں گا، سوتے نہیں رہنے دوں گا۔ آنکھیں کھولو۔ تمہارے آقا کا نواسہ تم کو جگا رہا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑو اور اس گھر تک پہنچا دو جہاں صبح صبح نور کے تڑکے آواز دیا کرتے تھے "الصلوٰۃ الصلوٰۃ یا رسول اللہ"۔ میرے آقا بلال میرے مولا بلال، میرے سید بلال۔ قدم دو، انھیں چوموں، جوتیوں کی خاک دو سر پہ رکھوں، آنکھوں میں ڈالوں۔"

ارضیت اور دل نشینی محاوروں کے چور دروازے سے بھی آثارِ خواجہ میں داخل ہوئی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی اردو دہلی کی ٹکسالی اردو ہے۔ مقامی رنگ کہاوتوں اور محاورں کی شکل میں ان کی عبارت میں داخل ہوا ہے۔ کہاوتوں اور محاوروں میں قرنہا قرن کے انسانی تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اس سرچشمے سے خواجہ نے اپنے خیابان تصانیف کو سیراب کیا ہے۔ ہیں نے ذوق کی حق تلفی کی طرف قارئین کو متوجہ کرتے ہوئے کبھی لکھا تھا کہ ذوق کے کلام کی توانائی اور بقا اور ارضیت کے ضامن وہ محاورے ہیں جنھیں انھوں نے اپنے کلام میں صرف کیا ہے۔ اس بارے میں وہ غالب پر فائق ہیں خواجہ حسن نظامی بھی اپنی ارضیت محاورہ بندی اور ان تشبیہات اور تمثیلات کی بدولت جن کو انھوں نے مرئی اور غیر مرئی، دنیا اور ماورا، مجاز اور حقیقت کے درمیان پل بنایا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد پر فائق ہیں۔

ابوالکلام آزاد کی نثر کے شکوہ اور معنویت اور ادبیت کے پرستار اُٹھتے جا رہے ہیں کیوں کہ فارسی اور عربی سے واقفیت معدوم ہو رہی ہے۔ لیکن خواجہ حسن نظامی کی بظاہر ہلکی پھلکی اور نسبتاً پیادہ رو نثر کو آبِ حیات سے سینچا گیا ہے۔

تصوّف اور تعقّل کی آمیزش اور آویزش خواجہ کے یہاں مسائل بھی پیدا کرتی ہے اور لطف بھی۔

اُنھوں نے تصوّف کی ترجمانی اور تبلیغ دلائل و براہین کے ساتھ کی۔ زاویے بدل بدل کر وہ اپنے نقطہ نظر کو ذہن نشین کراتے ہیں۔ ان کے صفحات میں عشق اور عقل کا

فصل مثلاً نظر آتا ہے۔ وہ کسی ایسی پرواز کے قائل نہیں جس میں وہ عوام کو ساتھ نہ لے جا سکیں۔ ان کی نثر کا حسن تشریح اور صراحت کا حسن ہے۔ الجھی ہوئی باتوں کو ان کی نوکِ خامہ بہ آسانی سلجھا دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو مثال کے طور پر ان کا وہ مضمون جو واقعۂ کربلا کے متعلق آکاش وانی سے نشر ہوا تھا۔ لیکن تشریح کی راہ پُر خطر بھی ہے جس میں اطناب اور طولِ کلام کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی ذات اور آثار میں وہ مقناطیسی کشش ہے جو ان مشاہیر کو بھی کھینچتی رہی اور ان قارئین کو بھی کھینچتی رہے گی جن کو خواجہ کے مسلک سے شدید اختلاف رہا ہے۔ علامہ اقبال اور مولانا محمد علی جیسے اکابر خواجہ کے زمرۂ احباب میں شامل تھے۔ تصوف کی راہ میں بعض جگہ خواجہ نے غلو کا وہ پہلو اختیار کیا جس کا ساتھ عامۃ المسلمین نہیں دے سکتے تھے مثلاً مرشد کو سجدۂ تعظیم کا جواز ان انحرافات سے قطع نظر خواجہ نے اپنے زرخیز اور پُر تاثیر قلم کو قوم کی اصلاح اور بہبود اور تصوف اور صلح مندی کی تلقین اور مزاروں کی تہذیب میں صرف کیا۔

اگرچہ خواجہ حسن نظامی کو اس رائے سے شدید اختلاف تھا جو اقبال نے روایتی تصوف کے تباہ کن اثرات کے متعلق ظاہر کی تھی اور جس کی لپیٹ میں حافظ شیرازی بھی آ گئے تھے، تاہم اگر غور کیجیے تو خود خواجہ صاحب اسرارِ خودی کے آشنا رموزِ بےخودی سے کم نہ تھے۔ ان کی شخصیت میں توانائی اور استیلا کی صلاحیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ملّا واحدی سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔

"خواجہ صاحب نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ میری قوم کے اندر بھی فاتح بننے اور حکومت کرنے کا مادّہ موجود ہوتا تو میں اپنی جبلتی خواہش اور قوم کے مادّے کو ضائع نہ جانے دیتا اور قطعی کہیں نہ کہیں کا بادشاہ ہو جاتا ..... خواجہ صاحب کی تصویر روپے پیسے پر تو نہیں چھپ سکی مگر خواجہ صاحب کا نام دلوں پر نقش ہو گیا۔" گویا خواجہ حسن نظامی نے تصوف میں بھی ایک نئی راہ نکالی اور خود گدازی کے ساتھ ساتھ خود افرازی کا طریق بھی اپنایا۔ یہی توانائی خود افرازی اور آرزومندی چھن چھن کر ان کی تحریر میں مترشح

ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ اعتراضات اور انحرافات سے اغماض برتنے کے بجائے قلمی مباحثے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان کی غیرتِ عقائد نے انھیں خاموش بیٹھنے نہیں دیا اور ان کے مزاج کی آرزومندی اور ان کے عزائم کی بلندی نے دشوار موڑ پر انھیں سرِ تسلیم خم کرنے سے روکا۔ ہمعصر اکابر سے وہ کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ خواجہ کے طرز نگارش کی تشکیل میں ان کی خود اعتمادی کو بڑا دخل ہے۔ ان کے تصوف کے دل کش تمول سے ان کے پیرایۂ بیان میں ایک عجیب شگفتگی اور تابانی آگئی ہے۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ خواجہ صاحب اپنے مفہوم کی وضاحت اور اپنے مقصد کی تکمیل اور بیان کی تاثیر کے لیے ڈرامائی یا محاکاتی پیرایۂ بیان اکثر اختیار کرتے روضۂ نبوی پر حاضر ہو رہے ہیں:

"اس سبزی کی جھلک نے جو کہرام گاڑی میں مچایا وہ دیکھنے کے قابل تھا، کلیجے پھٹے جاتے تھے، ہاتھ گریبانوں پر تھے، دل تھامتے تھے، کرتے چاک کرتے تھے، گردنیں کھڑکی سے باہر تھیں، آنکھیں ٹکٹکیاں باندھ رہی تھیں"۔ "دل دھڑک رہا ہے، اسے سنبھالا ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہے۔ جسم کی توانائی نے جواب دے دیا۔ کیا کروں؟ لوگو میرا ہاتھ پکڑنا میں چلا۔ سہارا دینا میں گرا" اگلی ہی سطر میں ندرت کی مثال ملے گی۔

"پلیٹ فارم کے سنگریزوں نے پاؤں سے مصافحہ کیا اور عبدالجواد آفندی نے ہاتھوں سے۔"

زبان اور محاورے کو تشبیہ کے راستے خواجہ صاحب بڑے پُرلطف لیکن بے صدا انداز سے نیا موڑ دے دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "ہماری تعداد دنیا میں ریل کی سڑک کی طرح پھیل رہی ہے۔"

بیان کے مرئی انداز کی مثالیں ہر ورق پر آنکھوں کی پذیرائی کرتی ہیں: "امت کے بیماروں کی طرف سے طبیب الکل کی کنڈی کھٹکھٹا رہا ہوں"۔ "ان انگریزوں کے وہم کی رگ بار بار پھڑکتی تھی۔"

اپنی آرزومندی اور بے خوفی کا ذکر خواجہ نے خود بھی کیا ہے۔

"میں اپنے جبلی ولولے سے بے خوف اور نڈر ہو کر بے سوچے جو کام کر جاتا ہوں ...... اگر ان دونوں کی احتیاطیں ...... مجھ کو مقید نہ رکھتیں تو میں یا تو پھانسی پا چکا ہوتا یا نظر بند انِ ہند کے ساتھ کسی جگہ قید ہوتا۔" انوکھی بات ہے۔ مرشد کے سامنے سجدے کو جائز سمجھنے والا یہ صوفی انقلابی اور باغیانہ مزاج لایا تھا جسے اس نے بڑے جتن سے طریقت اور اطاعت کی طرف موڑا۔ اسی عملِ ارتفاع کی کرشمہ سازی ہے جس کا ذکر آغازِ داستان میں آچکا ہے اور یہی شخصیت اور اسلوب کی وہ گنگا جمنی کیفیت ہے جسے میں نے داستان کا عنوان بنایا ہے۔

ان کی کتابیں نگار خانوں پر مشتمل ہیں" وہ مسجد جس کے سامنے ہمارے بوڑھے بزرگوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر گریں اور ان کی سفید داڑھیاں خون سے لال ہو گئیں"۔ خواجہ صاحب کی جگہ یہی بات اگر کوئی اور لکھتا تو شہیدوں اور زخمیوں کی تعداد گنتا۔ تذکرہ کانپور کی اس مسجد کا ہے جس کے ایک حصّے کو انگریز حاکم نے سڑک کی توسیع کے لیے شہید کر دیا تھا۔

خواجہ حسن نظامی کے ایک مضمون کا عنوان ہے۔" جبہ اور عمامہ کی کورنش" ۱۹۱۱ء کے دربار کا ایک پروگرام مشائخ، علماء اور سادھوؤں اور پنڈتوں کے سلام کا بھی تھا۔ شہنشاہ جارج پنجم اپنی ملکہ کے ساتھ لال قلعے کے جھروکوں میں بیٹھ گئے تھے اور قلعے کی دیوار کے نیچے ہندو مسلمان دینی پیشواؤں نے بہ یک وقت جمع ہو کر انھیں سلام کیا تھا اور دعائیں دی تھیں۔ اس مضمون سے خواجہ صاحب کی حمیت کے علاوہ اُن کی عنوان تراشی اور نعرہ تراشی کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے تجربے، روابط، مشاہدے اور موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سفر و حضر میں وہ لاکھوں آدمیوں سے ملے، ان کی دلچسپیاں لامحدود تھیں، ان کی نگاہ تیز تھی۔ ان کی معلومات وسیع اور مشاغل گوناگوں تھے اور یہ سب کچھ ان کی تحریروں [illegible] منعکس ہوا۔ وسعت [illegible] میں کم اہلِ قلم ان کے حریف ہوں گے نظیر اکبر آبادی جن [illegible] صاحب کا موازنہ کیا جاتا ہے ان کو نہیں پہنچتے۔ پر گو دونوں ہیں، دونوں

کا مشاہدہ وسیع ہے، دونوں کے یہاں مقامی رنگ ہے لیکن خواجہ صاحب کا کینوس زیادہ وسیع ہے اور ان کا اندازِ بیان نظیر اکبر آبادی کی طرح بے محابا نہیں بلکہ فن کارانہ مساعی کا نتیجہ ہے۔

تصوف کی بدولت خواجہ حسن نظامی کی نگاہ ہر گام پر کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھتی ہے اور انمل بے جوڑ چیزوں میں بھی وہ شباہت ڈھونڈھ لیتے ہیں، ناتہ جوڑ لیتے ہیں۔ بے جان چیزیں انھیں جاندار نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ اندازِ نظر اور یہ پیرایۂ بیان ان کی تحریروں کو خواص و عوام کے لیے دل کش بنا دیتا ہے۔ اپنے مضمون "بندوق" میں لکھتے ہیں "بندوق متوالی آنکھ کی پری ہے، نازک بدن ہے۔ نازک کمر ہے۔ اس کے جسم کو دیکھ کر معشوق کی نازک کلائی یاد آتی ہے۔ اس کی نال کا منہ ہرنی کی آنکھ سے مشابہ ہے، وہ ہرنی جس کی آنکھ کی مشابہت رسیلی کٹیلی آنکھوں سے دی جاتی ہے۔ ——بندوق کے پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں ہے۔"

یہ سطور سامنے آتی ہیں جو مشاہدے اور نفسیات سے گہری واقفیت کا پتہ دیتی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کی زبان ہلکی پھلکی اور شیریں ہے، اس میں ثقالت کا شائبہ بھی نہیں۔ ان کی نثر کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت اس کی روانی ہے اور ان کی عبارت کا صوتی حسن ایک نغمگی کا حامل ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملے لکھتے ہیں جو دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔ بقول ملا واحدی خواجہ صاحب کی آنکھوں میں موہنی تھی، خواجہ صاحب کی زبان میں موہنی تھی، خواجہ صاحب کی شخصیت میں موہنی تھی، خواجہ صاحب از سرتاپا موہ لینے والے تھے۔" ان کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑی جان ہے۔ چھوٹا جملہ جاندار کیوں نہ ہو کہ اس کا "فعل" مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اسما اور صفات کے جامد بوجھ کے نیچے جملے کو دبنے نہیں دیتا۔ انگریزی انشار پرداز، سوئفٹ نے کہا تھا کہ صفت اسم کی دشمن ہے خواجہ حسن نظامی بھی بالعموم صفت کے وافر استعمال سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن وزن اور توسیع کے لیے وہ مترادفات اور ہم قافیہ الفاظ کا استعمال جائز رکھتے ہیں، ایسے مترادفات کا بھی جو مفہوم کو آگے نہ بڑھا رہے ہوں۔

اجازت دیجیے کہ میں گفتگو کے پایان میں اُسی تصعید یا ارتفاع کا ذکر کر دوں جس سے

میں نے ان سطور کی تمہید اٹھائی تھی۔ خواجہ حسن نظامی نے ایسے خدوخال کے حسن کا ارتفاع اپنے قلمی حسن پاروں کی شکل میں کیا ہے۔ انھوں نے اپنی انفرادی آرزومندی اور انقلاب، استیلا اور بغاوت کے رجحانات کو تصوّف سے زیر کیا۔ اور تصوّف اور جذبۂ سرافرازی کے قرآن کو تحریر و تقریر کے ذریعے قوم کی اصلاح اور خانقاہوں کے سدھار اور انسان دوستی کی تبلیغ کے لیے استعمال کیا۔

انھوں نے دین و دنیا، اکابر و اصاغر، شریعت و طریقت، تصوّف و تعقل، انکسار اور استیلا، ماضی و مستقبل، کثرت و وحدت، متانت و شگفتگی، صحافت و ادب، نثر اور شعریت تجزیہ اور تخییل، قدامت اور پیش بینی کو اپنی تخلیقات میں سمو کر ایک گنگا جمنی طلسم تیار کردیا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

خواجہ حسن نظامی کی نثری ارضیت

خواجہ حسن نظامی کا نام اردو کے ان ادیبوں میں ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا جائے گا جو اردو کی اردوئیت کے رمز شناس تھے اور جنھوں نے اپنے زورِ قلم سے اردو کے حسن کو نکھارا اور اس کی کشش کو سب سے تسلیم کرایا۔ ان کی تصانیف کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ وہ صوفیِ صافی اور درویشِ دلریش تھے اور اُنھوں نے جو کچھ بھی لکھا معاشرے کی دینی، اخلاقی اور روحانی اصلاح کے لیے لکھا۔ وہ تصوف کی ایک ایسی عظیم بالشان روایت کے امین تھے، جس کے فیوض و برکات برِصغیر کی تہذیبی اور روحانی تاریخ کا حصہ ہیں اور جس کے نورِ ہدایت سے کروڑوں دلوں کو باطنی سکون کی دولت نصیب ہوئی۔ روحانیت کی یہ روایت صدیوں تک دانشوری کی بھی روایت رہی ہے۔ اور اردو زبان و ادب پر اس کا گہرا اثر رہا ہے۔ صوفیہ کا رابطہ چونکہ عوام سے تھا، اس لیے انھوں نے ہمیشہ عوام کی زبان کو ترجیح دی، اور اردو کے سادہ اور سہل اسلوب کو اختیار کیا تاکہ اپنے مطالب کو عوام کے دلوں تک پہنچا سکیں۔ خواجہ حسن نظامی نے بھی سلیس اور عام فہم زبان کو اپنایا۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے "ہمارے مخاطب جاہل لوگ ہیں۔ ہم کو ان کی زبان میں بات کرنی ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہزاروں پڑھے لکھے عالم فاضل موجود ہیں، مگر ان غریبوں کا کوئی نہیں۔" مولوی عبدالحق اس معاملے میں ان سے بھی آگے تھے۔ خواجہ صاحب کا مسئلہ تو اُن

کے قارئین اور ارادت مندوں کا تھا، مولوی صاحب سادگی اور سہولت کا رشتہ اردو کے لسانی مزاج سے جوڑتے ہوئے لکھتے ہیں "آج کل اپنی جہالت چھپانے یا اپنی علمیت جتانے کے لیے خواہ مخواہ بعض لوگ عربی فارسی ترکیبوں اور مشکل اور دقیق الفاظ کا بوجھ بے چاری اردو کی گردن پر ڈالتے ہیں کہ وہ اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہ اردو کی ترقی نہیں تنزل ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اردو مقبول ہو، مگر ان کی تحریروں سے وہ مرزود ہوتی ہے۔ جو فصاحت سادگی میں ہے، وہ ان پیچیدہ تحریروں میں کہاں؟ یہ گر کوئی خواجہ صاحب سے سیکھے۔"

خواجہ صاحب نے سادہ وسلیس زبان کو تو اپنایا لیکن ان کا اصل کمال اس میں ہے کہ انھوں نے نثر میں ایسا طرز اور ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا کہ خشک اخلاقی وروحانی واصلاحی مباحث کو مذہب یا تصوف کے دائرے سے نکال کر ادب میں لے آئے۔ ان کی تحریروں کا غالب محرک شاید یہی جذبہ ہے کہ ان کی آواز دل سے اُٹھے اور دل پر اثر کرے۔ خود انھوں نے اعتراف کیا ہے۔ "یہ تحریریں ان کے لیے ہیں جو دل رکھتے ہیں۔" مولوی عبدالحق کا خیال ہے۔ "خواجہ حسن نظامی کی عبارت میں چونچلا ہے جو سیدھی سادی بات کو پھول کی طرح شگفتہ کر دیتا ہے" لیکن یہ خوبی ان کی سب تحریروں میں یکساں نہیں ملتی۔ خواجہ حسن نظامی نے دینی مضامین بھی لکھے، قصّے کہانیاں بھی لکھیں، تاریخی واقعات بھی لکھے، اخبار نویسی اور صحافت بھی کی۔ لیکن ان کی عبارت کے جوہر ان چھوٹے چھوٹے مضامین ہی میں کھلتے ہیں جن میں سیدھی سادی باتوں کو اُنھوں نے اپنے "چونچلے" یعنی نثر کی تخلیقیت سے "پھول کی طرح شگفتہ" کر دیا ہے۔ یہی وہ تحریریں ہیں جن کے ذریعے انھوں نے صوفیانہ مضامین کو تصوف سے نکال کر ادبی سطح پر پیش کیا۔ یہ مضامین چھوٹی چھوٹی معمولی چیزوں پر ہیں مثلاً دیا سلائی، لالٹین کوئلہ، مچھر، مٹی کا تیل، مکھی، اوس، روٹی، سوئی، پسینہ، ہچکی۔ ایسی تحریروں میں بات سے بات پیدا کرتے ہوئے جس طرح تمثیل اور تجسیم کے پیرائے میں خواجہ صاحب نے بذلہ سنجی کا حق ادا کیا ہے، دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اردو میں مضمون یعنی انشائیے کا

وجود تو پہلے سے تھا اور تمثیلی مضامین یا کہانیاں بھی لکھی جا چکی تھیں، لیکن اس نوعیت کے عارفانہ انشائیے، جن میں تصوف وادبیت کا امتزاج ہو، اس سے پہلے نہ تھے اس رنگ کی ابتدا کرنے والے خواجہ صاحب ہی تھے، اور یہ انھیں کے ساتھ ختم بھی ہو گیا اگرچہ بہتوں نے تقلید کی کوشش کی لیکن یہ کسی سے نبھ نہ سکا۔ خواجہ صاحب کی کاروباری دینی اور صحافتی تحریروں کے مقابلے میں معمولی چیزوں پر لکھے گئے یہ چھوٹے چھوٹے مضامین ہی ان کا اصل ادبی کارنامہ ہے اور یہی اردو ادب میں ان کی بقا کے ضامن بھی ہیں۔ پال والیری نے زبان کے ادبی استعمال کے بارے میں بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ زبان کا مقصد چونکہ ترسیل ہے اس لیے عام زبان معانی کی ترسیل کے ساتھ ساتھ تحلیل ہو جاتی ہے، یعنی الگ سے اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ اور اگر وجود باقی رہے یعنی زبان اپنی حیثیت سے قائم بالذات رہے تو یہی اس کی ادبیت کی پہچان ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے مضامین اس اعتبار سے ادبی امتیاز کے حامل ہیں کہ ان میں مطالب کی ترسیل کے ساتھ ساتھ زبان کی اپنی حیثیت بھی برقرار رہتی ہے۔ ان مضامین کو انشائیہ ان کی زبان کی اس خوبی نے بنایا ہے جس کی شیرازہ بندی فکری ندرت، بات میں بات پیدا کرنے کے ملکہ اور سامنے کی چیزوں میں روحانی جہت دیکھنے کی صلاحیت سے ہوتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے اسلوب کی سلاست و لطافت اور روزمرے اور محاورے کی سب نے داد دی ہے، لیکن ان کی نثر کا نسب نامہ جس طرح محمد حسین آزاد یا غالب سے ملایا جاتا ہے، اسلوبیاتی اعتبار سے وہ مناسب نہیں ہے۔ اگرچہ خواجہ صاحب نے محمد حسین آزاد کو اپنا معنوی استاد تسلیم کیا ہے لیکن ایسا صرف تجسیم و تمثیل کے انداز کی حد تک ہے جو بہر حال خواجہ صاحب کے یہاں بڑے پیمانے پر نہیں ملتا۔ خواجہ صاحب کی نثر کا مزاج محمد حسین آزاد کی نثر سے جو نہایت مزین اور بھیلی نثر ہے، بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے خواجہ حسن نظامی اور غالب کی نثر کا ذکر ایک سانس میں کیا ہے اور کہا ہے کہ بس فرق صرف اتنا ہے کہ غالب کی طنز و ظرافت کی جگہ خواجہ صاحب کے یہاں سوز و گداز نے لے لی ہے، تو یہ بھی کچھ صحیح نہیں، کیوں کہ اسلوب شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور دونوں کی شخصیتوں میں قطبین

کا فرق ہے۔ کہاں غالبؔ کی انانیت اور کہاں خواجہ صاحب کی سپردگی! کہاں امارت کی خوبو اور کہاں عوام سے خطاب کی ضرورت ہمکالمے کے استعمال سے البتہ دھوکا ہو سکتا ہے۔ غالب کے یہاں مکالمے کا استعمال ذاتی وجاہت کے اظہار اور ایک نئے ادبی طرز کی طرح ڈالنے کے لیے ہے، جبکہ خواجہ صاحب کے یہاں یہ عوام کے دل تک پہنچنے کے لیے ہے۔ چنانچہ اس سوال کو بعد میں لیا جائے گا کہ اگر خواجہ حسن نظامی کے اسلوب کا رشتہ کسی سے ملانا ہی ہے تو اس انداز کی نثر کا جدِ امجد کون ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی نثر کی ایک نمایاں خوبی اس کی وارفتگی اور سپردگی ہے۔ ان کے بیشتر مضامین میں ایک مقام پر پہنچ کر مناجات کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سطح پر ان کی نثر کے جوہر کھلتے ہیں۔ ملا واحدی نے تصدیق کی ہے کہ خواجہ صاحب کو مضامین تین حالتوں میں سوجھتے تھے، گانے یعنی سماع میں، تھیٹر یعنی ڈرامے میں یا کسی آشفتہ حال عاشق کو دیکھنے سے۔ اس سے غالباً ان کے حساس دل پر چوٹ سی لگتی تھی اور یہی چوٹ نثر کی تخلیقیت میں اپنی تطہیر کی راہ تلاش کر لیتی تھی۔ ذیل کے اجزا میں احساس کی محویت ملاحظہ ہو:

"// میری بیٹی حور بانو نے پاؤ پارہ قرآن شریف کا صبح سے شام تک یاد کر لیا۔ // پکانے والی نے آٹا گوندھا تھا // اب روٹی پکا رہی ہے // مگر میں اس کو کعبے کی کالی چادر میں / مدینے کے سبز غلاف میں / اجمیر کے صندل میں / دہلی کے نظام الدین میں / نماز کے سجدے میں / بیوہ کی آہِ سرد میں / یتیم کی چشمِ تر میں / مظلوم کی مایوسی میں / ظالم کی خود فراموشی میں / ڈھونڈھ چکا // ہر دروازے کی کنڈی بجا چکا // آنسو بھی بہائے / ہاتھ بھی پھیلائے / لیکن اس کا دامن نصیب نہ ہوا // میں نیا گرفتار نہیں ہوں // میری اسیری پرانی ہے // مگر اب بھی مجھ کو فریاد کرنی نہیں آتی // اس کی ناز برداریاں نہیں جانتا // کوئی ہے جو مجھے بتائے کہ میں اسے کیونکر پاؤں //۔"

(کعبے والے خدا کو کیوں کر پاؤں)

// موسیٰ کے زمانے کا چرواہا ہوتا / تو تجھ کو اپنے گھر بلاتا / پاؤں دباتا / سر دھلاتا /

ٹھنڈا ٹھنڈا دودھ پلاتا // تو سوتا / تو پنکھا جھلتا / تو سنتا / تو گانا گاتا / روتا رُلاتا / جلدا تو روکتا / پیروں پڑتا / ہاتھ جوڑتا //۔

// داتا تو کہاں ہے // میرے من کی بپتا کے دیکھن ہار // موٹی مورتی سُن // اُلجھنوں میں ہوں / گردشوں میں ہوں // بے قراری دیکھ / آہ وزاری دیکھ / اشکباری دیکھ //

// آنسو دے / ان میں نہاؤں / سوزش دے / تڑپوں / لوٹوں / تجھ کو پاؤں / بلال کا دل دے / درِ آستاں پہ سر ٹکراؤں // عزت تجھ سے ہے // ذلت تجھ سے ہے // میرے پربھو بھگوان // اپنے بھگت کے بس میں آجا / دے جا / دلا جا //

// یہ رات کیوں کر کٹے // تو یاد آتا ہے / کلیجہ منہ کو آتا ہے // اپنے داس کو درشن دے / روپ دکھا / جلوہ افروز ہو / آنکھ بے ہوش / اور من سنتوش ہو // کس کا بلقان / کیسا ایران / تیری رحمت کا سرچشمہ / اور اس میں اشنان / اس میں ہیں دونوں جہان // رین اندھیری / بدلی کالی / رستہ بھاری // دشمن سر پر / غفلت دل میں // ہاتھ پکڑ / بھگوان / میں قربان // تجھ کو دیکھوں / اور نہ دیکھوں کوئی / سب ہوں گم / تو کہے گر تم //

// شوکت والے / طاقت والے / توپوں اور سنگینوں والے / زخموں اور مرہم والے // دکھ کے کرتا سُکھ سروپ / تیرے بھوکے / تیرے پیاسے // یہ ہے چھاؤں / تو ہو پاس / پھول بھی تو / خار بھی تیرا / نور بھی تو / نار بھی تیری / آنکھیں میری / سب کچھ تیرا / اور نین کے اندر ڈیرا تیرا // بس میں آ بھگوان //۔

// سر ہے حاضر کھینچے کٹاری / عشق کی اگنی چتا ہماری // ست پکے رہیں / ست بن جائیں / جز دکو تیاگیں / کل ہو جائیں / یثرب پہنچیں / مکہ دیکھیں / بیچ سمندر جھنڈا گاڑیں / مہدی بابو گونجیں گرجیں / ان کے آگے چل کر کڑکیں // تیر چلے سب سینوں پہ / دشمن چھدے سنگینوں پر //"

(بھگت کے بس میں آ بھگوان)

یہ نثر تخیلی سرشاری کا پتہ دیتی ہے، اس لیے وارفتگی کے ساتھ ساتھ اس کی اہم خوبی اس کا صوتی آہنگ اور متوازی کلموں کا غیر ارادی و غیر شعوری استعمال ہے۔ سیموئل لوین (SAMUEL LEVIN) نے زبان کے ادبی حسن کی ایک پہچان COUPLINGS

کے استعمال کو قرار دیا ہے یعنی ایسے کلموں یا صرفی و نحوی اجزا کی ہم آہنگی یا تکرار جن میں صوتی، صرفی یا نحوی مطابقت ہو، خواجہ صاحب کی نثر میں قدم قدم پر اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ علم بدیع میں سجع و ترصیع کا تصور پایا جاتا ہے، لیکن دونوں کی بنیاد حروف یا وزن کی محدود اور جامد مطابقت پر ہے جب کہ COUPLINGS کا تصور ان سے کہیں زیادہ متحرک، وسیع اور جامع ہے اور یہ ہر طرح کی صرفی و نحوی اور صوتی مطابقت اور متوازیت پر حاوی ہے۔ مثلاً کلمۂ اسمیہ کی جگہ اسمیہ خواہ وہ ایک لفظ کا ہو دو کا یا زیادہ کا یا فعلیہ کی جگہ فعلیہ۔ نیز مطابقت صرف حروف کی نہیں، صوتی نظام کی یا پورے اجزائے کلام کی بھی ہو سکتی ہے۔ خواجہ صاحب کے یہاں جگہ جگہ پر یہ چیز فطری طور پر پیدا ہو گئی ہے۔ اوپر جو اقتباس پیش کیا گیا ہے اس نظر سے ایک بار پھر ملاحظہ کر لیا جائے۔ دو آڑی لکیروں کے درمیان جتنے کلمے ہیں ان میں باہم دگر متوازیت ہے۔ یہ متوازیت کئی قسم کی ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ صرف ایک نظر دیکھ لینے ہی سے اس کا احساس ہوگا کہ اس نثر کی موسیقیت اور ادبیت میں اس غیر ارادی متوازیت اور مطابقت کا گہرا ہاتھ ہے۔ ان تمام جملوں میں خطاب کی کیفیت ہے۔ خواجہ صاحب کی تحریروں میں خطاب کہیں خدا سے ہے کہیں بے جان اشیا سے اور کہیں ہزاروں لاکھوں ارادت مند انسانوں سے۔ اس نثر میں مکالمے سے کام لینے کا جواز بھی یہی ہے۔ اسلوبیاتی اعتبار سے اسے مکالماتی نثر کا نام دینا نامناسب نہ ہوگا۔

خواجہ حسن نظامی کے مکالماتی اسلوب نے کہیں کہیں بیگماتی زبان سے بھی فیضان حاصل کیا ہے، غدر کے افسانے، بیگمات کے آنسو، اور مضامین میں موقع و محل کی رعایت سے دلی کی عورتوں کی زبان اور روزمرہ کی چمک دیکھی جا سکتی ہے۔

"یہ ترتیب نہیں، بڑی قطامہ ہے۔ میں نے آواز دی کہ ذرا بچے کو سلا دے تو کانوں میں لول مار کر چپ ہو گئی اور سنی ان سنی کر دی۔

(بیگمات کے آنسو)

"تہور خاں کی بیوی آخر کا فقرہ سن کر جل کر کباب ہو گئیں اور دانت پیس کر

بولیں اللہ اللہ اس بلی کی سی آنکھوں والی کو یہ دن لگے۔ اگر اس کی چوٹی پکڑ کر بھری محفل میں جوتیاں نہ لگوائیں تو میرا نام پلٹ کر رکھ دینا۔"

(اولاد کی شادی)

"کیا اس کی متیا مرتی ہے یا کانوں سے بہری ہے جو بچے کے بلکنے کی اسے خبر نہیں ہوتی یا قصائی ہے کہ ننھی سی جان کو پچھاڑ رکھا ہے۔"

(بیوی کی تعلیم)

اس نثر کی ایک اور خوبی اس کا پراکرتی احساس ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے کئی مضامین کے عنوانات یوں ہیں۔ "ہردواری گنگا کے کنارے" "چنتا من مورتی" "رس کے بھرے تورے نین" "ہم ہیں بالک ایک پتا کے" "بھگت کے بس میں آ بھگوان" "پردیسی بیتمہ دیکھی تہاری پیت" "گیان کتھا" "شملہ کی دیبی ماتا" "من کہ ایک دھوبی" "کاغذی گھاٹ پر" "رام اُپدیش" "ایکو برہمن دوتیو ناستی" لیکن ان عنوانات سے یہ قیاس نہیں ہونا چاہیے کہ خواجہ حسن نظامی کی پراکرتیت صرف انھیں مضامین تک محدود ہے۔ یہ چوں کہ ان کے تخلیقی مزاج کا حصّہ ہے، اس کی جھلک ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہے، اور اس کا معنوی اور اسلوبیاتی رشتہ لوک ساہتیہ کی اس عظیم روایت سے مل جاتا ہے جو صوفیہ حضرات کی عوامی وابستگی کے طور پر ہر دور میں کم و بیش موجود رہی ہے۔ ہندوستانی ادبیات اور یہاں کے لوک ساہتیہ میں صوفیہ کا جو بیش بہا حصّہ ہے وہ دھرتی کے اسی احساس کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسی روایت کا ایک سرا عہدِ وسطیٰ کے ہندوستانی سنگیت سے اور دوسرا ادبیات سے جڑا ہوا ہے کہیں یہ احساس راگ راگنیوں میں ڈھل کر اُبھرتا ہے اور کہیں یہ ہولیوں، ٹھمریوں، دادرے، پیلو اور بسنت کے بول بن کر کانوں میں رس گھولتا ہے۔ قدیم صوفیہ حضرات سے ہندوی کے جو کلمات، اجزا یا ریختہ غزلیں منسوب ہیں، وہ بھی اسی کیفیت کی تصدیق کرتی ہیں کہ صوفیہ کا رشتہ ہندوستانی زبان کی لوک روایت یعنی عوامی روایت سے کبھی منقطع نہیں ہوا۔ حضرت بابا فرید گنج شکر ہوں یا حمید الدین ناگوری، شرف الدین بو علی قلندر ہوں، نظام الدین اولیا ہوں یا برہان الدین غریب،

بندہ نواز گیسو دراز ہوں یا بہاؤالدین باجن ہوں، ہندوستانی زبان کے لوک ساہتیہ کے اولین نقوش انھیں حضرات کے یہاں ملتے ہیں۔ امیر خسرو اسی روایت کی نہایت واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ امیر خسرو کو اگر اس کا نقطۂ آغاز تسلیم کیا جائے تو خواجہ حسن نظامی اس کا نقطۂ ارتقا ہیں۔ آج سے چھ سات سو سال پہلے کی بات اور تھی۔ اس وقت زبان ناپختہ اور ان گھڑ تھی اور صوفیہ حضرات عوام سے خطاب کرنے کے لیے ملی جلی زبان کو اختیار کرنے پر مجبور تھے، لیکن بیسویں صدی میں جب زبان کے معیار اور اسالیب ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکے ہیں، یہ غور طلب ہے کہ خواجہ صاحب کو معیاری زبان میں بولی ٹھولی کی آمیزش کی کیا ضرورت تھی؟ بات دراصل اردو کے عوامی مزاج کی، اس کے نسلی تقاضوں کی اور اپنی دھرتی پر پیر رکھنے کی یعنی لاکھوں کروڑوں لوگوں سے ان کے شعوری اور غیر شعوری احساسات کی سطح پر ان سے ہم کلام ہونے کی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر سے ظاہر ہے کہ ان کو عوامی تقاضوں کی ارضیت کے اس راز کا عرفان تھا۔ ان کی تحریریں اکثر جگہ ان کا پراکرتی احساس بے تابانہ اُبھر کر سامنے آتا ہے اور پھر پورے کے پورے اجزا اسی کیفیت میں ہو جاتے ہیں۔ ہم نے شروع میں کہا تھا کہ خواجہ حسن نظامی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے روحانی اور اخلاقی مسائل کو مذہب یا تصوف کے دائرے سے نکال کر ادب میں داخل کیا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ادبیت کو پراکرتی احساس سے جلا دی اور اس کا رشتہ لوک ساہتیہ کی صدیوں پرانی اس تاریخی روایت سے جوڑ دیا جس کی کارفرمائی قدیم صوفیہ کے یہاں ملتی ہے اور جس نے تصوف اور بھگتی تحریک دونوں سے فیضان حاصل کیا تھا۔ خواجہ حسن نظامی کو ان کی اس ارضیت اور پراکرتی احساس کی بنا پر اگر اردو نثر کا نظیر اکبر آبادی کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ دونوں رسمیات سے بالاتر تھے، دونوں کی زندگی بے لوث اور بے ریا تھی، دونوں عوام کے لیے لکھتے تھے، دونوں کی ترغیب ذہنی کا تعلق عوام کے تقاضوں سے تھا اور دونوں کی طاقت اور تخلیقیت کا راز ان کی عوامی وابستگی میں پوشیدہ ہے۔ دونوں نے ایسی اصناف کو اپنایا جن کا اس وقت زیادہ رواج نہیں تھا۔ یعنی نظیر

نے نظم کے مختلف سانچوں کو اور خواجہ حسن نظامی نے مضمون نگاری کو، اور دونوں نے اپنی تخلیقی اور لسانی غذا معمولی آدمی سے اور دھرتی کے سینے سے حاصل کی۔

لوک روایت سے صوفیہ کی وابستگی میں اور خواجہ حسن نظامی کی وابستگی میں ایک ہلکا سا فرق ہے۔ وہ یہ کہ جن صوفیہ کے یہاں کرشن جی اور دوسرے ہندوستانی اساطیر؛ علائم کا ذکر ملتا ہے، وہاں اکثر و بیشتر ہندوستانی احساس اور اسلامی احساس کی دو الگ الگ سطحیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس خواجہ حسن نظامی کے یہاں یہ دونوں سطحیں گھل مل کر ایک ہو گئی ہیں، اور ان کی تخلیقیت ایک طرح کے رموز و علائم سے دوسری طرح کے مفاہیم کو شدتِ تاثیر اور دل کو چھو لینے والی کیفیت کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہو جاتی ہے۔ اساطیری اور تاریخی رموز و علائم کا تہذیبی اختلاط، نیز معنوی توسیع پسندی اور ہم آہنگی اتنے بڑے پیمانے پر اردو نثر میں کہیں اور دکھائی نہیں دیتی۔ اس طرح خواجہ حسن نظامی نے ان رموز و علائم کو جن کا تعلق دھرتی کے رشتوں اور نسلی تقاضوں سے ہے، ایک نئی معنوی جہت عطا کی ہے جو بجائے خود ایک تخلیقی شان رکھتی ہے بعض مضامین پورے کے پورے اس رنگ میں ہیں۔ بعض کو وہ ایک رنگ میں شروع کرتے ہیں، پھر دوسری کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور بالآخر دونوں کیفیتیں گھل مل کر ایک مخلوط کیفیت کو راہ دیتی ہیں۔ مثلاً "مست الست کی دعا" یوں شروع ہوتی ہے۔

"بجلی میں چمکنے والے، چاند میں جھلکنے والے، رات کے اندھیرے، سورج کی روشنی، آسمان کی بلندی، دریا کی روانی، جنگل کی سنسانی، دل گیری و دل داری کے مالک، عرش کی اقامت میں جدا، دل کے گھرانے میں، خدا ہم تیرے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اگر تو عرش پر ہے تو ہم کو سربلند کر، فرش میں ہے تو وسعت و ثابت قدمی عطا فرما۔ اگر تو ہر جگہ ہے تو ہم کو بھی ہر جگہ پہنچا۔"

عین اس کے بعد یہ دوسری کیفیت ابھرتی ہے۔

"ہے پربھو پرشوتم، پرم آتما، اگر تو نرگن ہے تو ہم کو سوگن بنا دے۔ نراکار ہے تو

ہماری شکلیں بھی مٹا دے، سگن بن جا، ساکار ہو جا اور اپنی پریم شکتی کو دنیا میں پرگٹ کر۔ ہم کس سے فریاد کریں۔ تیرے سوا کس کو دیکھیں۔ اے مکہ کے سیاہ پوش مکان پر نظرِ خاص رکھنے والے...... اے ہر ذرہ کے دوار پر رہنے والے ہم یقین دلاتے ہیں کہ تو ہی ہے اور کوئی نہیں۔ تو نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اور جو کچھ ہے، کچھ بھی نہیں تو ہی تو ہے اور بس۔" اسی طرح ایک مضمون جو "منتظرِ فراق" یعنی وفات الرسول کے بارے میں ہے یوں شروع ہوتا ہے:

"پتی کی ستی بی بی عائشہ کی افسردگی دیکھی نہیں جاتی۔ ست پتا کی جائی ست پتی کی من موہنی، برج کائنات کے سب سے بڑے شام سندر کی منظورِ نظر، صدیق کی گود میں پلنے والی، کیسی اداس، نڈھال، سرِ رسول کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ آج اس کی راجدھانی ہاتھوں سے چھن رہی ہے۔ آج اس کا دھنی دنیا سے منہ موڑ رہا ہے۔"

"اچھی بابل کیا لاڈلی بیٹی کو بھول گئے" ایک خط کے پیرائے میں لکھا گیا ہے جس میں امت کی سسرال کی طرف سے مدنی میکے سے خطاب کیا گیا ہے۔ سارا مضمون زمینی احساس کی منتقلی اور توسیع پر مبنی ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

> "ہائے بابل وہ دن یاد آتا ہے جب میں آپ کی انگنائی میں کھیلتی پھرتی تھی اور آپ مجھ کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے تھے۔ میں بگاڑتی تھی، آپ سنوارتے تھے۔ میں روتی تھی آپ آنسو پونچھتے تھے۔ میں ضد کرتی تھی آپ ناز برداری کرتے تھے۔ میری فکر میں آپ نے رات کو سونا چھوڑ دیا تھا۔ سات سات دن فاقے جس کے لیے ہوتے تھے وہ یہی پھوٹی قسمت کی کنیز ہے۔ اچھی بابل میرا بیاہ رچادو، اچھی بابل مجھے مہندی منگادو، اچھی بابل میرا منڈھا چھوادو، سب پربتوں کے بانس کٹوادو، سب باغوں کے پھول پتے منگواؤ، مجھے سہاگ کی چوڑیاں پہناؤ، اپنی لاڈلی کو بھول نہ جاؤ۔ وہ تم ہی پر آسرا رکھتی ہے۔"

"مذہبی شام سندر کی مرلی" میں بھی خواجہ حسن نظامی کے اس اسلوبیاتی

اختلاط کو معراج پر دیکھا جا سکتا ہے۔

"زلفوں والے پیتم پیارے / شیرب باشی موہن کنہیا کی بانسری کے بلہاری / حجازی پربت میں کھڑے ہو کر ایسی بجائی کہ جنم جنم کے دکھ کلیش دور ہو گئے / روح، آتما، جیو، شریر سب کو سرشار و پُر کیف بنا دیا۔"

"مگر اب زمانہ گزر گیا / مدتیں بیت گئیں / شیام سندر کی مرلی کی آواز سنائی نہیں دیتی / جنگل کے ہرن / باغوں کے مور / آم کی ٹہنی / سب اس پیاری اور سریلی صدا کی راہ دیکھ رہے ہیں / جس کی کوک کلیجے میں ہوک پیدا کرتی ہے / برسات کا موسم قریب آیا / کالی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آئیں گی اور کرشن کنہیا کی بانسری کو ڈھونڈھیں گی / کوئی چاتر سمجھ دار سکھی سہیلی ایسی نہیں جو شیام سندر کو سندیسا لیجائے /۔

یہ مضمون ختم یوں ہوتا ہے:

"آہا / وہ دیکھو / شیام سندر مُرلی لیے بن سے نکلے / وہ ہمارے سیناپتی تیر کمان سنبھالے نمودار ہوئے / اب کوئی دم میں مرلیا باجے گی / اور نین کی بدلی برسے گی / ندی نالے سوکھے تھے / گنگا جمنا پیاسی تھیں / گھمٹ کے تیرتھ سونے تھے / بھگتی کا تھا کال پڑا / ست کے گلے جنجال پڑا / اب مرگ کی ترشنا دور ہوئی / اور چنتا من کا نور ہوئی / اب ہر کی آمد آمد ہے / اب ہر کی آمد آمد ہے / سنسار کا داتا آتا ہے / اور ہر کا جھنڈا لاتا ہے / بانس کی مرلی صور ہے یہ / اور پستک کا مسطور ہے یہ /۔"

اس اقتباس میں اور اس سے پہلے جو اجزا پیش کیے گئے ان میں اس صرفی و نحوی و صوتی مطابقت و متوازیت کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر کے اس مطالعے کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک منفرد اسلوب اور طرزِ خاص کے مالک تھے جس میں دہلوی زبان کا چٹخارہ اور روزمرّے اور محاورے کا لطف، سادگی اور سلاست، بانکپن اور شگفتگی اور بے تکلفی:

بے ساختگی کی جملہ خوبیاں تو تھیں ہی لیکن ان کا کارنامہ یہ ہے کہ جہاں انھوں نے خشک مذہبی اور اصلاحی مباحث کو تصوف کے دائرے سے نکال کر ادب میں داخل کیا، وہاں اس کا رشتہ ہندوستانی لوک ساہتیہ کی پراکرتی روایت سے بھی جوڑ دیا۔ اس رنگ کی تقلید کی کوشش بیسیوں نے کی لیکن کوئی اسے پا نہ سکا۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر کا نسب نامہ محمد حسین آزاد یا غالبؔ سے ملانا مناسب نہیں، البتہ اس کا رشتہ اگر ملانا ہی ہے تو اس کا سراغ اس سے بھی پہلے کے زمانے میں لگانا چاہیے۔ چنانچہ زمینی احساس کی اس نثر کا اگر کوئی جدِّ امجد ہو سکتا ہے تو وہ میر امّن دہلوی ہیں۔ دونوں کے یہاں دھرتی کی بو باس ہے۔ دونوں کے یہاں دہلوی زبان بغیر کسی تصنع کے سامنے آتی ہے دونوں کے یہاں سارا زور لطف و تاثیر پر ہے۔ دونوں کی عبارت میں، بولی ٹھولی، کہاوتوں اور دوہوں کے اجزا تحلیل ہو گئے ہیں اور اس طرح میر امّن کے زمینی احساس کا سیدھا رشتہ خواجہ حسن نظامی کی ارضیت سے مل جاتا ہے۔ دہلوی اردو کو سنوارنے، نکھارنے اور اس کے سجل روپ کو پیش کرنے والوں کا جب جب نام لیا جائے گا، خواجہ حسن نظامی کا ذکر احترام سے کیا جائے گا۔

محمد عبداللہ قریشی

علّامہ اقبالؒ اور خواجہ حسن نظامیؒ

علامہ اقبالؔ اور خواجہ حسن نظامی دونوں کا خمیر محبت کے ضامن سے اُٹھایا گیا تھا۔ دونوں اخوتِ اسلامی کے رشتے میں بندھے ایک دوسرے کے نام کی مالا جپتے تھے۔ بے نفس دوستی کی نیو تو اسی وقت جم گئی تھی جب دونوں نے لکھنا شروع کیا تھا اور اخبار و رسائل کے ذریعے ان کے رشحاتِ قلم سامنے آنے لگے تھے۔ خواجہ صاحب نے نثر نویسی میں کمال پیدا کیا۔ ان کے البیلے اسلوبِ نگارش نے بہت جلد اردو دنیا سے اپنا لوہا منوالیا۔ علامہ اقبالؔ نظم کے ذریعے اپنے افکار و خیالات پیش کر کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے۔ شاعری سے ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ پڑھنے والوں میں بھی وہی خیالات موج زن ہو جائیں جو ان کے اپنے قلب و روح میں طوفان برپا کر رہے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ:

> ”اگر میں خواجہ صاحب جیسی نثر لکھنے پر قادر ہوتا تو کبھی شاعری کو اظہارِ خیال کا ذریعہ نہ بناتا۔“

اس کے برعکس خواجہ صاحب کی رائے یہ تھی کہ اگرچہ:

> ”ڈاکٹر اقبالؔ سلیس اردو پر قادر نہیں مگر جذبات کو متحرک و مضطرب کر دینے کی ان کو بڑی قدرت ہے۔ حیاتِ انسانی کی مختلف شاخوں پر جس خوبی سے وہ لکھتے ہیں اور جو سوز کی تاثیر پیدا کر سکتے ہیں اور کسی میں یہ بات

کم پائی جائے گی۔"[1]

بہر حال دونوں کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب خواجہ صاحب نے پنجاب کا چوتھا سفر کیا۔ "آپ بیتی" خواجہ حسن نظامی کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنے والد مرحوم اور بھائی مرحوم کے ہمراہ پنجاب کے دو سفر خورد سالی میں کیے۔ تیسرا سفر حضرت مولانا شاہ سلیمان چشتی قادری پھلواروی ؒ کی معیت میں بھاول پور کا ہوا۔ اس سفر میں پہلی بار شیخ عبدالقادر مدیر مخزن سے ملاقات ہوئی جو اس زمانے میں اخبار و اسٹیج کے آفتاب بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے خواجہ صاحب کو دیکھ کر کہا کہ "شیخ محمد اقبال صاحب کا خیال تھا کہ حسن نظامی بہت بڈھے آدمی ہیں اور میں کہتا تھا کہ وہ نو عمر ہیں۔ آج دیکھ کر مجھ کو اپنے اندازے کی تصدیق ہوگئی کہ وہ صحیح تھا۔"[2]

اس سفر کے بعد چوتھا سفر پنجاب کا وہ تھا جس میں شیخ محمد اقبال سے ملاقات ہوئی اور پنجاب کے قومی خیالات کا ایک گہرا نقش لے کر خواجہ صاحب دہلی واپس گئے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

"ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب سے میرا ملنا جلنا ۱۹۰۳ء سے تھا۔ ایک دفعہ انجمن حمایت اسلام لاہور میں انھوں نے اپنی نظم خاص لحن سے پڑھی اور مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں نے اپنا عمامہ سر سے اتار کر ان کو دے دیا اور کہا:

"تمھارے جام مے کی نذر میری پارسائی ہو"

اراکین انجمن نے عمامہ نیلام کیا اور حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر نے اس کو خرید لیا۔ اس جلسے میں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد بھی تھے۔"[3]

یوں ایک ایسی مستحکم اور پائیدار دوستی کی بنیاد قائم ہوگئی، جسے زمانے کی کوئی گردش

---

[1] اتالیق خطوط نویسی از خواجہ حسن نظامی، ص ۱۴

[2] آپ بیتی خواجہ حسن نظامی، ص ۶۹

[3] دیباچہ کتاب "پاکستان کے موجد اول ڈاکٹر سر محمد اقبال کے خطبے خواجہ حسن نظامی دہلوی کے نام"۔

گزند نہ پہنچا سکی اور جس کی نسبت خواجہ صاحب کا خیال تھا کہ "ملنساری کا برتاؤ اور چیز ہے اور دوستی کسی اور شے کو کہتے ہیں۔ دوستی ایک ناقابلِ ختم ملنساری ہے اور جیسی زندگی کو اس کی ضرورت ہے ویسی ہی مشکل سے وہ میسر آتی ہے۔[۱]"

اقبال کی زندگی تک میل ملاپ کا سلسلہ بھی جاری رہا اور خطوں کے ذریعے دلوں کا تبادلہ بھی ہوتا رہا۔ اقبال کے سینکڑوں خطوں میں سے چند خط، جو خواجہ صاحب کی کتاب "اتالیق خطوط نویسی" میں دیگر مشاہیر کے خطوں کے ساتھ نمونے کے طور پر محفوظ رہ گئے ہیں، دونوں کے خوش گوار تعلقات کی جیتی جاگتی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ یہ کتاب نومبر ۱۹۲۶ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔ اس کے چار ایڈیشن بعد میں نکلے۔ قیامِ پاکستان کے بعد خواجہ صاحب نے اس کتاب سے اقبال کے خطوط الگ کر کے بھی شائع کیے اور اس کتابچے کا نام "پاکستان کے موجدِ اوّل ڈاکٹر سر محمد اقبال کے خطوط خواجہ حسن نظامی کے نام" رکھا۔ دیباچے میں اس اشاعت کی وجہ یہ بیان کی:

"اب اِن خطوں کو اس لیے شائع کیا جاتا ہے کہ پاکستان بن گیا ہے جس کا خیال سب سے پہلے ان کے دل میں آیا تھا اور انھوں نے بار بار زبانی مجھے پاکستان کا منصوبہ سنایا تھا۔ مگر اس منصوبے میں ہندوستان کی تقسیم کا خیال نہیں تھا۔ بلکہ ساری اسلامی دنیا کے اتحاد کو وہ پاکستان کہتے تھے، البتہ اُن کا خیال تھا کہ پاکستان ہندوستان میں بنایا جائے اور ساری اسلامی دنیا کا ہندوستان مرکز بن جائے۔ ان خطوں میں بھی اس خیال کے اشارات کئی جگہ ہیں۔ اس سلسلے میں وہ کئی بار میرے پاس دہلی آئے اور میں بھی کئی بار ان کے پاس لاہور آتا جاتا رہا۔"

دوسری وجہ اس غلط فہمی کا ازالہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب میں مثنوی "اسرارِ خودی" کی اشاعت پر اختلاف ہو گیا تھا۔ اس کی نسبت خواجہ صاحب نے وضاحت فرمائی:

---

[۱] "آپ بیتی"، خواجہ حسن نظامی، ص ۱۲۲۔

"مثنوی 'اسرارِ خودی' کے بنیادی اصول میں مجھے ان سے اختلاف نہ تھا۔ بلکہ حضرت حافظ وغیرہ شعراء اور مشائخ صوفیہ کے بعض خیالات کی نسبت جو کچھ اُنھوں نے لکھا میں نے اور حضرت اکبر الٰہ آبادی نے ان سے اختلاف کیا تھا، جس کو مخالفین نے اصل حقیقت سے بڑھا چڑھا کر مشہور کیا تھا۔ مگر اقبال آخر تک میرے دوست رہے اور اُن کے برتاؤ میں کچھ فرق نہیں آیا۔

"بہر حال اب میرے مرنے کا وقت قریب ہے اس لیے میں ان خطوط کو اس غرض سے شائع کرتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے باشندگان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں اور ان کو ان خطوط سے اندازہ ہو جائے کہ انھوں نے اپنی مثنوی کا نام رکھنے سے پہلے مجھ سے مشورہ لیا تھا۔

"میرا ایمان ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صرف ہندوستان ہی کے نہیں بلکہ پورے ایشیا کے ہیرو اور لیڈر تھے اور ایشیا کی بیداری ان کی برکاتِ باطن کا نتیجہ تھی[1]۔"

اقبال کے یہی خطوط شیخ عطاء اللہ مرحوم نے "اتالیق خطوط نویسی" سے لے کر اپنی تالیف "اقبال نامہ" میں شائع کیے ہیں۔ چونکہ "اقبال نامہ" بہ آسانی دستیاب ہو جاتا ہے۔ اس لیے آئندہ مضمون میں جہاں ضرورت پیش آئے گی اسی کے حوالے دیے جائیں گے۔

خواجہ حسن نظامی کی ابتدائی زندگی بڑی عسرت و تنگدستی اور نہایت مشکلات سے گزری۔ برادری کے لوگ ان سے خدا واسطے کا بیر رکھتے تھے۔ ان کو قوت لایموت حاصل کرنے کے لیے کئی قسم کے پاپڑ بیلنے پڑتے اور بے حد دوڑ دھوپ کرنی پڑتی تھی۔ اسی محنت و مشقت نے ان کو کامیابی سے ہمکنار کر کے فائز المرام کیا۔ ۱۹۰۴ء میں خاندان کے کسی دشمن نے ان کے مرنے کی بدخبر اڑائی، بعد میں اس کی تردید ہو گئی۔ علامہ اقبال نے اپنے ۲۲ جولائی ۱۹۰۴ء کے خط میں خواجہ صاحب کو لکھا:

---

[1] دیباچہ کتاب "پاکستان کے موجدِ اوّل ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے خطوط خواجہ حسن نظامی دہلوی کے نام"

"دو دفعہ پیسہ اخبار میں میں نے وہ خبر پڑھی جسے پڑھ کر لاہور کے دوستوں کو بے انتہا تشویش تھی مگر قدرت خدا کی مجھے مطلق رنج نہ محسوس ہوا۔ اور اسی بنا پر جس دوست نے مجھ سے پوچھا میں نے بے تکلف کہہ دیا کہ خبر غلط ہے۔ الحمدللہ کہ ایسا ہی ثابت ہوا اور میں لاہور کے احباب میں مفت کا صوفی مشہور ہوگیا۔ ایسی خبریں زیادتی عمر کی علامت ہیں۔ اس خبر سے کم از کم یہ تو معلوم ہوگیا کہ ملک کو آپ کی کس قدر ضرورت ہے انشاء اللہ میں بھی تعطیلوں میں، اگر ممکن ہوا تو، آپ سے دہلی میں ملوں گا"[1]

۱۹۰۵ء-۰۶ء میں خواجہ صاحب ہندو فقیروں، سادھوؤں، جوگیوں اور ان کے متبرک تیرتھوں کی سیر کے شوق میں متھرا، بنارس، بندرابن، ہردوار، جگن ناتھ وغیرہ گئے اور ایک رسالہ "تیرتھ یاترا" بھی لکھا۔ اس سفر میں اقبال قدم قدم پر یاد آئے۔ وہ ان دنوں کیمرج میں زیر تعلیم تھے۔ انھوں نے وہاں سے ۲۵/اپریل ۱۹۰۶ء کو لکھا:

"سرمست سیاح کو سلام، متھرا، ہردوار، جگن ناتھ امرناتھ جی سب کی سیر کی مبارک ہو مگر بنارس جاکر لیلام ہوگئے، کیوں ٹھیک ہے نا؟ بلکہ ہمارے میر نیرنگ اور اکرام کو بھی ساتھ لے ڈوبے۔

"میرے پہلو میں ایک چھوٹا سا بت خانہ ہے کہ ہر بت اس صنم کدے کا رشکِ صنعتِ آذری ہے۔ اس پرانے مکان کی کبھی سیر کی ہے؟ خدا کی قسم! بنارس کا بازار فراموش کر جاؤ۔ میں تو ہر ہر قدم پر آپ کو یاد آتا تھا۔ کیوں نہ یاد آؤں؟ آپ بھی ہم کو یہاں عموماً یاد آیا کرتے ہیں"[2]

اقبال کو انگلستان اور جرمنی میں جو علمی فتوحات حاصل ہو رہی تھیں ان کو خواجہ صاحب خوب اچھالتے تھے۔ اس بنا پر بعض دوست خواجہ صاحب کو قابلِ مبارک باد سمجھتے تھے،

---

[1] اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، جلد دوم، ص ۳۵۲۔

[2] اقبال نامہ، جلد ۲، ص ۳۵۶۔

اقبال نے ۱۰ فروری ۱۹۰۸ء کو لندن سے خواجہ صاحب کو لکھا:

"میری کامیابیوں پر جو لوگ آپ کو مبارک باد دیتے ہیں، راستی پر ہیں۔ مجھ میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے۔ دیکھنے کو دو، حقیقت میں ایک۔[1]"

ولایت سے پی۔ ایچ۔ ڈی اور بیرسٹری کی سندلے کر واپس آنے پر بھی خواجہ صاحب نے اقبال کی شان میں بہت کچھ لکھا اس احسان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو سیالکوٹ سے اقبال نے نہایت انکسار سے تحریر فرمایا:

"آپ لوگوں کو میرا اشتاق بناتے ہیں، مجھے کچھ اعتراض نہیں مگر اندیشہ ہے کہ مجھ سے مل کر انھیں مایوسی نہ ہو۔ آپ اپنی ہر تحریک میں بغیر پوچھے مجھے شریک تصور کیجیے مگر جس درد نے کئی مہینوں سے مجھے بے تاب کر رکھا ہے، جو مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا، جو مجھے تنہائی میں رُلاتا ہے، اس کی وجہ مجھ سے پہلے سن لیجیے، پھر جو چاہے کیجیے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور آپ میرے[2] ساتھ۔"

۲۴ جون ۱۹۱۲ء کو حضرت علامہ پھر لکھتے ہیں:

"آپ سے ملنے کو دل چاہتا ہے مگر کیا کروں، علائق نہیں چھوڑتے۔ روٹی کا دھندہ لاہور سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ کیا کروں عجب طرح کا قفس ہے۔[3]"

ہندوستان میں احیاے اسلام کی خاطر جو بزرگ اس وقت مختلف حلقوں میں کام کر رہے تھے، اخبار توحید میرٹھ میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے خواجہ صاحب سے اقبال کا نام کسی وجہ سے چوک گیا تھا۔ اقبال نے اس فرد گذاشت پر دوستانہ شکوہ کرتے ہوئے

---

[1] اقبال نامہ، جلد ۲ ص ۳۵۸

[2] اقبال نامہ، جلد ۲ ص ۳۶۰-۳۶۱۔

[3] اقبال نامہ، جلد ۲، ص ۳۶۵

خواجہ صاحب کو لکھا:

"خدا آپ کا بھلا کرے کہ آپ نے ہندوستان کے پُرانے بُت کدے میں توحید کی مشعل روشن کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دل اس کی حرارت سے گرمائیں گے اور آنکھیں اس کے نور سے منور ہوں گی میں بھی اپنی بساط کے موافق کچھ نہ کچھ حاضر کروں گا۔

"مسلمانانِ ہندوستان کی بیداری کے پانچ اسباب جو آپ نے اس ہفتے کے "توحید" میں ارقام فرمائے ہیں، بالکل بجا ہیں۔ لیکن آپ نے یہ نہیں لکھا کہ اقبال جس نے اسلامی قومیت کی حقیقت کا راز اس وقت منکشف کیا جب ہندوستان والے اس سے غافل تھے اور جس کے اشعار کی تاریخ زمیندار، کامریڈ، البلقان، طرابلس اور نواب وقار الملک کی حق گوئی کی تاریخ سے پہلے کی ہے، کس کا خوشہ چیں ہے؟ شاعروں کی بدنصیبی ہے کہ ان کا کام بُرا بھلا کچھ بھی ہو، غیر محسوس ہوتا ہے اور ظاہر بیں آنکھیں مرئیات کی طرف قدرتاً زیادہ متوجہ ہوتی ہیں۔

"اس خط کا مقصد شکایت نہیں اور نہ یہ کہ اقبال کے کام کا اشتہار ہو۔ حسن نظامی کو خوب معلوم ہے کہ اس کا دوست اشتہار پسند مزاج لے کر دنیا میں نہیں آیا مگر یہ مقصد اس خط کا ضرور ہے کہ ایک واقفِ حال دوست کی غلط فہمی دور ہو تاکہ اقبال کی وقعت اپنے دوست کی نگاہ میں محض اس خیال سے کم نہ ہو کہ اس نے مسلمانانِ ہندوستان کی بیداری میں حصہ نہیں لیا:

به کلامِ بیدل اگر رسی مگذر ز جادۂ منصفی
کہ کسے نمی طلبد ز تو صلۂ دگر مگر آفریں"[1]

۱۹۱۴ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے انتیسویں سالانہ اجلاس میں لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کے رنگ میں چند چھوٹی چھوٹی طنزیہ مزاحیہ نظمیں سنائیں۔ انھوں نے تو مذاقاً ان کا عنوان "رگڑا" رکھا تھا مگر وہ کتابی صورت میں "اکبری اقبال" کے نام سے شائع ہوئیں۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کی نہایت شگفتہ تمہید لکھی۔ کتاب "اکبری اقبال"

[1] اقبال نامہ، جلد ۲، ص ۳۶۵-۳۶۶

اب نایاب ہے۔ اِس کی بعض منتخب نظمیں "بانگِ درا" میں آگئی ہیں۔ البتہ خواجہ صاحب کی تمہید جو تبرک کا درجہ رکھتی ہے، ان کی یادگار کے طور پر محفوظ کرنے کے لیے ذیل میں درج کی جاتی ہے:

"لاہور میں سیالکوٹ کے رہنے والے ایک آدمی رہتے ہیں، جن کا نام محمد اقبال ہے اور ڈاکٹر ہے اور بیرسٹر ہے اور پی۔ ایچ۔ ڈی ہے۔ وہ شعر گاتے، شعر بجاتے ہیں۔ اور موقع پاتے ہیں تو شعر پیدا بھی کر لیتے ہیں۔

"میں نے ان کو آدمی اس ڈر سے کہا کہ جو لوگ آدمیت کی عینک لگائے ہوئے ہیں اور اقبال ان کو آدمی ہی نظر آتے ہیں، کہیں وہ مجھ سے ثبوت نہ مانگ بیٹھیں۔ ورنہ میں اقبال کو پیکرِ خاک نہیں سمجھتا اور اُن کے پُتلے کو آدم زاد نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ وہ بشر ہوں مگر ان کی بشریت فقط ان کی بیوی بچوں یا ان کے لیے مبارک ہو جو اُن کو گورا چٹا مونچھوں والا عقلمند پروفیسر و بیرسٹر کہتے ہیں۔

"میں نے پروفیسر اقبال کو بھی دیکھا ہے اور ڈاکٹر اقبال کو بھی۔ سیالکوٹی اقبال کو بھی۔ یورپی اقبال بھی دیکھا ہے اور لندنی اقبال کو بھی۔ مگر آدمی کبھی نہیں پایا۔ وہ ازل سے حیوان ہیں اور حیاتِ ابدی کے نشان ہیں، ہندوستان کے آدمی حیوان کے لفظ کو مکروہ جانتے ہیں مگر میں اس لفظ میں وہ جان پاتا ہوں جو ہندوستان کے کسی انسان میں نہیں۔

" برسات میں مکھیاں اور پروانے دونوں پیدا ہوتے اور دونوں جاندار کہلاتے ہیں۔ مگر ایک آدمی کو ستاتا اور مگسِ بے حیا نام پاتا ہے اور دوسرا شمع کے رُخ پر قربان ہو جاتا اور عبرت ڈھونڈنے والوں کو صبح کے وقت اپنی لاش دکھا کر رلاتا ہے۔"

"اقبال بھی ایک پروانہ ہے جو ان دیکھی شمع کا دیوانہ ہے۔ مکھیاں اس کے اشعار کو مٹھاس سمجھ کر چاٹتی ہیں اور پروانے شعلہ سمجھ کر قربان ہونے آتے ہیں۔

"اقبال ہمیشہ آسمان پر اُڑتے ہیں۔ زمین پر کبھی آنا ہوتا ہے تو اس زمین

میں جو آسمان سے زیادہ دور ہوتی ہے۔ اس لیے وہ لوگ جن کے پاس ہوائی جہاز نہیں ہیں یہ کہتے رہ جاتے ہیں کہ اقبال کہاں ہیں؟ ہم ان تک کیونکر پہنچیں۔!

"ایک بار بھری سبھا کے اندر اقبال زمین پر آئے اور چند جملے ان کی زبان میں سنائے، جو زمانے کی زبان کہلاتے ہیں، جن کا نام اکبر ہے، جو الہ آباد میں بیٹھ کر اللہ کی آبادیاں بساتے ہیں۔ اکبر کے ہم زبان ہو کر بولنا آسان بات نہیں ہے۔ اکبر اشاراتِ ربانی کے حامل ہیں۔ اکبر کو گویا کرنے والا پہلے آنکھ سے دکھاتا ہے پھر قلم سے لکھواتا ہے۔ اکبر کی ہر بات زمین اور آسمان کو ایک کر دیتی ہے۔ ہر قول وہ وجود لے کر آتا ہے جس کو انگریزی میں کیرکٹر کہتے ہیں۔ اکبر نے اس دھوپ میں بال سفید کیے ہیں جس نے اسلامی سلطنت کا باغ خشک کر دیا۔ اقبال نے اکبری زبان میں جو کچھ کہا وہ "اکبری اقبال" ہے۔ خلقت اس کو دیکھتی ہے کہ اقبال نے کس حد تک اکبر کی روش کو نبھایا ہے اور اکبر کی طرح کیوں کر تنگ قافیوں کو کشادہ کیا ہے مگر دیکھنا یہ تھا کہ زمانہ اکبر کی زبان میں بولتے بولتے اب اقبال کی زبان میں بھی آیا ہے خدا خیر کرے دیکھیں ان حروف کے پردے سے کیا نکلنے والا ہے۔

"ہندوستان کی بے قراری میں کام کی باتیں درکار ہیں۔ جن میں نتائج ہوں اور چلنے کے لیے راستہ ہو۔ عبرت کے لیے دل خوش کن آگاہی و تنبیہ ہو۔ اکبر اور اقبال کا ابتدا سے یہی شیوہ رہا ہے۔ مگر اقبال نے اور طریق سے کہا اور اکبر نے اور پیرائے سے۔ اس نظم میں جو منشی مرغوب رقم صاحب کے ذریعے شائع ہوئی ہے، اقبال نے اکبری نقشِ قدم پر پاؤں اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ مضبوطی سے ہر نشان پر پاؤں جمایا ہے مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اس نظم پر وہ لکھوں جس کو لوگ "ریویو" کہتے ہیں۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ بہتے ہوئے دریا کی روانی کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ دوسرا اس کے تیز بہاؤ کی حقیقت پر لیکچر دے۔ موجیں مارنے والا سمندر جب خود نظر آتا ہے، تو کسی کا یہ کہنا کہ کشتیاں چکرائیں گی، سواریوں کو

جھکڑ آئیں گے، بادل اٹھیں گے اور زمین پر مینھ برسائیں گے، فضول ہے۔ جاننے والے خود جانتے ہیں کہ یہ طوفان کسی موسم کی خبر دیا کرتا ہے۔ اس واسطے میں اس نظم کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا اور نہ کہنا ہی اس کی اعلیٰ شان کی دلیل ہے۔"

۱۹۱۵ء کے آغاز میں خواجہ صاحب نے اقبال کی اسلامی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں "سرالوصال" کا خطاب عطا فرمایا۔ اقبال نے ۷ فروری ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھا:

"آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت اور استحکام پر بحث کی ہے، اب قریباً تیار ہے اور پریس میں جانے کو ہے۔ اس کے لیے کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمایئے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کا نام اسرارِ حیات، پیامِ سروش، پیامِ نو، آئینِ نو، تجویز کیے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمایئے اور نتائجِ سے مجھے مطلع کیجیے تاکہ میں انتخاب کر سکوں[1]"

یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ خواجہ صاحب نے کون کون سے نام تجویز کیے، البتہ اقبال نے اس مثنوی کو "اسرارِ خودی" کے نام سے شائع کیا۔ خواجہ حسن نظامی جون ۱۹۵۰ء کے "منادی" میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر سر محمد اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی کا نام میں نے تجویز کیا تھا اور بھی کئی نام تجویز کیے تھے۔ مگر انھوں نے اس کو پسند کیا۔[2]"

مثنوی اسرارِ خودی کا شائع ہونا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ چونکہ مثنوی کا علمِ کلام عام سطح سے بلند تھا، اس لیے تصوف کے بعض مسائل مثلاً وحدت الوجود، تنزلاتِ ستہ اور ترکِ دنیا (رہبانیت) وغیرہ سے لوگوں نے اختلاف کیا اور مخالفت کا ایک زبردست طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بعض صوفی، پیر اور سجادہ نشین، جنھیں روایاتِ باطلہ کی پابندی اور

---

[1] اقبال نامہ، جلد ۲، ص ۳۶۸۔

[2] ماہنامہ منادی، دہلی، بابت جون ۱۹۵۰ء

شریعتِ حقہ سے ناواقفیت کی نمائندگی کا شرف حاصل تھا، اقبال کے خلاف صف آرا ہو گئے اور انھوں نے خوب خوب ضربیں لگائیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ خواجہ حسن نظامی اور ان کے مرید اس جنگ میں سب سے پیش پیش تھے۔ خواجہ صاحب نے اس بات کا تو اعتراف کیا کہ:

"حضرتِ اقبال کے کمالِ شاعری، سوز و گداز اور اس اثر سے انکار کرنا، جس نے مسلمانوں کی موجودہ نسل کو بیدار کیا، آفتاب کے وجود سے انکار کرنا ہے۔ وہ میرے اس زمانے سے دوست ہیں جب ان کی کارگذاری نے نیا نیا نشان بلند کیا تھا۔ میں ہمیشہ ان کے علم کے نیچے رہا۔ میں نے زبان سے قلم سے اور ہر ایک طریقے سے، جس پر مجھ کو قابو تھا، اقبال کے خیالات کی تبلیغ کی۔ میرے عقیدے میں اقبال کا پایہ اس توصیف سے بھی کہیں بلند ہے جس کو جناب "کشاف" نے بیان کیا ہے۔[1]"

لیکن اس کے باوجود مثنوی کے خلاف نہ صرف خود نہایت زوردار مضامین لکھے بلکہ دوسروں سے بھی لکھوائے۔ آپ نے کہا:

"میں اقبال کی نیت پر حملہ نہیں کروں گا، اس لیے نہیں کہ وہ میرے دوست ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ بڑے آدمی ہیں بلکہ اس لیے کہ سالہا سال سے میں ان کے خیال و ارادہ کو جانتا ہوں۔ انھوں نے تو یہ مثنوی اپنی دانست میں مسلمانوں کے فائدے کے لیے لکھی ہوگی مگر اس سے سخت خطرے پیدا ہوں گے اور مسلمانوں کے اصولی عقائد میں تزلزل پڑ جائے گا۔ درحقیقت یہ مثنوی اقبال کی نہیں بلکہ اقتضائے وقت کی لسانِ حال ہے۔ وقت کی خواہش ہے کہ مشرقی مغربی بن جائیں مگر کیا وہ ایسا کر سکے گا؟ اس سے کہہ دو کہ نہیں:

---

[1] مضمون کشافِ خودی از خواجہ حسن نظامی، مطبوعہ وکیل امرتسر ۲۹ دسمبر ۱۹۱۵ء مجلہ اقبال لاہور اکتوبر ۱۹۵۳ء ص۔

سانچے گرو کا بالکا مرے نہ مارا جائے

"حضرت حافظ (شیرازی) کی اقبال نے کیسی آبروریزی کی ہے؟ کیسے کریہہ الفاظ میں ان کو یاد کیا ہے؟ اگر وہ سمجھے ہیں کہ حافظ کے کلام نے مسلمانوں کو کم ہمت بنا دیا تو میں پوچھوں گا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دنیا مردار کی مذمت کی تھی، اس سے مسلمانوں کی ہمت نہ ٹوٹی، حضور اور سب صحابہ دین کو مقدم اور دنیا کو مؤخر کہتے تھے۔ انھوں نے کیسی کیسی فتوحات کیں۔ اسرارِ خودی دنیا کو مقدم کہہ کر کیا دکھا سکے گی؟

"اسرارِ خودی" میں کن کن یورپین فلاسفروں کی روح ہے؟ اس کو ذرا سمجھ لینے دو۔ گو ہم بے علم ہیں بے سہارے ہیں مگر دین کی حمایت میں ہم سے جو کچھ بن پڑے گا، کریں گے۔ اقبال سے خدانخواستہ دشمنی نہیں۔ لیکن دوستی کو عقائد میں حائل ہونے کا کوئی حق نہیں۔ مسلمان اپنی مذہبی رائے میں کسی دنیاوی تعلق کا پابند نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا میں بھی نہیں ہوں[1]"

اسی پر بس نہیں کی، خواجہ صاحب نے مندرجہ ذیل آٹھ سوال مرتب کر کے بعض مشائخ کرام کے پاس بھیجے اور ان کے جوابات کی، جو مثنوی پڑھے بغیر دیے گئے تھے۔ خوب خوب اشاعت کی۔

۱۔ کیا قرآن شریف عقیدۂ وحدت الوجود کا مخالف ہے؟
۲۔ کیا توحید اور وحدت الوجود دو جداگانہ اشیاء ہیں؟
۳۔ کیا اسلام صرف انانیت مٹانے کو آیا ہے؟
۴۔ تصوف کا انتہائی نتیجہ اور مقصود کیا ہے؟
۵۔ کیا صحابۂ کرام میں کیفِ سکر مثل خواجہ حافظ شیرازی کے کسی میں نہ تھا؟
۶۔ صوفیوں کی حالت سلوک کے کسی مقام کو مفید ہے یا نہیں؟

---

[1] سہ ماہی اقبال لاہور اکتوبر ۱۹۵۳ء، ص ۷۸-۷۹۔

۷۔ کیا کیفیتِ وحدت الوجود کسی مقام کا نام ہے اور اس مقام کے بعد کیا مقام ہے؟ کیا حضرت ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد عدم محض تسلیم کیا ہے اور یہ مذہبی امور میں مفید ہے یا نہیں؟

۸۔ کیا وحدت الوجود محض علمی مسئلہ ہے یا اس کو مذہب سے بھی کچھ تعلق ہے؟

اس سے بھی آگے بڑھ کر ۳۰ جون ۱۹۱۶ء کے رسالہ "خطیب" دہلی میں خواجہ صاحب نے "سرِ اسرارِ خودی" کے عنوان سے مثنوی کے اصول پر بحث کی اور مندرجۂ ذیل پانچ وجوہ کی بنا پر اسے نامعقول قرار دیا۔

"اول یہ کہ اقبال نے اس مثنوی میں خودی کی حفاظت پر جو کچھ لکھا ہے وہ کچھ انوکھا اور نرالا نہیں، بلکہ قرآن شریف کی تعلیم سے بہت ہی کم ہے، لہٰذا بمقابلۂ قرآن اس کی ضرورت نہیں۔

دوم یہ کہ دیباچے میں مسئلۂ وحدت الوجود اور صوفیوں کو ملزم قرار دیا گیا ہے کہ ترکِ خودی کا جذبہ اس مسئلے اور وحدت الوجود کے مقلد صوفیہ کے سبب قوم میں پیدا ہوا۔ پرائیویٹ خط و کتابت میں بھی حضرت اقبال نے اس پر بہت زور دیا ہے اور ان کے احباب بھی صاف صاف کہتے ہیں کہ اس مثنوی کا اصل مقصد صوفی تحریک کا دنیا سے مٹانا ہے۔ پس چونکہ ان کا ارادہ بے بنیاد ہے اور وہ قیامت تک اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا میں بھی اس مثنوی کو بے نتیجہ تصور کرتا ہوں اور لغویت سے اختلاف ضروری ہے۔

سوم مصنف نے دیباچے میں مسلمانوں کو بہ پیروی حکمائے یورپ اپنے عقائد بدل دینے کی صلاح دی ہے۔

چہارم یہ مثنوی گو خودداری سکھاتی ہے مگر ساتھ ہی اس کے مغربی خود غرضی بھی سکھاتی ہے جو اسلام کے سراسر خلاف ہے۔

پنجم اس مثنوی نے میری خودی کی توہین کی ہے۔"

جب علامہ اقبال کے عقائد کی نسبت لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلنی شروع ہوئیں اور مسائل کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا تو انھوں نے مخالفوں کے اعتراضات کا جواب دینے اور اپنے نظریے کی وضاحت کے لیے خود بھی چند مضامین لکھے جو اس وقت کے اخباروں بالخصوص "وکیل" امرتسر "نیو ایرا" لکھنؤ میں شائع ہوئے خواجہ حسن نظامی کو خاص طور پر مخاطب کرکے آپ نے فرمایا:

"مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے عشق ہے پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ آپ کو ایک حقیقتِ اسلامی معلوم ہو جائے اور آپ اس سے انکار کریں۔ بلکہ مجھے ابھی سے یقین ہے کہ آپ بالآخر میرے ساتھ اتفاق کریں گے۔ میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے کہ میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی قوی ہو گیا ہے۔ کیوں کہ فلسفۂ یورپ بحیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رُخ کرتا ہے۔ مگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔"[1]

اس کے بعد علامہ اقبال نے ایک ایک کرکے ہر اعتراض کا جواب نہایت وضاحت اور جامعیت سے دیا۔ مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک مسئلے میں بھی بڑی صاف گوئی اور استدلال سے کام لیا۔ بڑے آدمیوں کی طرح کوئی ایسی بات نہ کی جس سے موقع بہ موقع کترا کے نکل جانے کی گنجائش باقی رہے۔ ان کو اپنے آپ پر پورا اعتماد تھا۔ وہ فلسفی اور مفکر ہونے کے علاوہ بہت اچھے قانون داں بھی تھے۔ وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے اس میں جذبات کو اتنا دخل نہ ہوتا جتنا کہ سوچ سمجھ اور فکر و تدبر کو دخل ہوتا تھا۔ انھوں

---

[1] سہ ماہی اقبال لاہور، اپریل ۱۹۵۴ء، ص ۴۴۔

نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا اس میں مغز کے علاوہ ایک اچھے قانون داں اور اچھی وکالت کرنے والے کا منطقی ربط بھی تھا۔ چنانچہ اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے حضرت علامہ نے فرمایا:

"مندرجۂ بالا سطور سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ فلسفیانہ اور مؤرخانہ اعتبار سے مجھے بعض ایسے مسائل سے اختلاف ہے جو حقیقت میں فلسفے کے مسائل ہیں مگر جن کو عام طور پر تصوف کے مسائل سمجھا جاتا ہے۔ تصوف کے مقاصد سے مجھے کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے۔ کوئی مسلمان ہے جو ان لوگوں کو بُرا سمجھے جن کا نصب العین محبتِ رسول اللہ ہے اور جو اس ذریعے سے ذاتِ باری سے تعلق پیدا کر کے اپنے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر میں تمام صوفیا کا مخالف ہوتا تو مثنوی میں ان کی حکایات و مقولات سے استدلال نہ کرتا۔"

اس موقع پر حضرت اکبر الہ آبادی نے ثالث بالخیر کا کردار ادا کیا۔ انھوں نے پہلے تو اس مخالفت کو کوئی اہمیت ہی نہ دی بلکہ سرسری طور پر اپنے رنگ میں کہہ دیا:

حضرتِ اقبال اور خواجہ حسن
پہلوانی اُن میں اِن میں بانکپن
جب نہیں ہے زورِ شاہی کے لیے
آؤ گتھ جائیں خدا ہی کے لیے
ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی
ہاتھا پائی کو تصوف ہی سہی
ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص
می کند دیوانہ با دیوانہ رقص[1]

---

[1] خطوطِ اکبر بنام خواجہ حسن نظامی (۱۹۲۲ء) ص ۲۴۔

لیکن جب معاملہ حد سے بڑھ گیا اور بحث اُلٹی سیدھی ہونے لگی تو ایک طرف علامہ صاحب کو ردکا اور دوسری طرف خواجہ صاحب کو پرخلوص مشورہ دیا:

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد
قومی رکنوں کے ہیں نگہباں وہ بھی
تم محو ہو حسن کی تجلّی میں اگر
ہیں دشمنِ فتنۂ رقیباں وہ بھی
پریوں کے لیے جنون ہے تم کو اگر
دیووں کے لیے ہے سلیماں وہ بھی[1]

میں اس تمام بحث کو نہایت تفصیل کے ساتھ اپنے مضمون "معرکۂ اسرارِ خودی" میں بیان کر چکا ہوں، جو رسالہ "اقبال" لاہور بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء اور اپریل ۱۹۵۴ء میں چھپ چکا ہے۔ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ لب لباب یہ ہے کہ اقبال کو اس قلمی جنگ میں کامیابی ہوئی۔ انھوں نے مثنوی کے دوسرے ایڈیشن میں بعض جگہ لفظی ترمیمیں کر کے میدان مار لیا۔ ان کا فلسفۂ خودی مقبولِ خاص و عام ہوا اور خواجہ حسن نظامی بھی پہلے کی طرح ہمنوا و شیر و شکر ہو کر اقبال کی دوستی کا دم بھرنے لگے۔

۱۹۱۸ء میں پھر غلط فہمی کے امکانات پیدا ہوئے لیکن بات بڑھنے نہ پائی۔ پہلی عالمی جنگ کی وجہ سے روزنامہ "زمیندار" پر حکومت ہند نے پابندی لگا کر مولانا ظفر علی خاں کو ان کے گاؤں کرم آباد میں نظر بند کر دیا تھا مگر انھوں نے سیاست سے کنارہ کش رہنے کا وعدہ کر کے ہفتہ وار "ستارۂ صبح" جاری کر لیا تھا۔ گرمیِ بازار کی خاطر انھوں نے جھوٹے تصوف اور پیشہ ور صوفیوں اور پیروں کے خلاف ایک سلسلۂ مضامین شروع کر دیا اس پر خواجہ حسن نظامی کو شبہ گذرا کہ یہ علامہ اقبال کی شہ پر ہو رہا ہے۔ بدمزگی بڑھنے ہی والی تھی کہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی کے مشترک دوست میر غلام بھیک نیرنگ

---

[1] خطوطِ اکبر بنام خواجہ حسن نظامی (۱۹۲۲ء)۔ ص ۳۹۔

نے خواجہ صاحب کو وضاحتی خط لکھ کر مغالطہ دور کر دیا۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے اقبال کو معذرت کا خط لکھا:

"محب الفقرا جناب شیخ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب!

السلام علیکم

آج محبی میر نیرنگ صاحب کے خط نے مجھے ایک بڑے مغالطے سے بچا لیا اور میں ان کا از حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی ذاتی طمانیت کا اظہار کرکے مجھے ایک بدگمانی کے گناہ سے نجات دی۔ میں آپ سے معذرت کرنے کو یہ خط لکھتا ہوں۔ مجھے لاہور کے متعدد حضرات نے تحریری و زبانی اطلاعیں دی تھیں کہ اخبار "ستارۂ صبح" کی آڑ میں آپ ہیں مگر مجھے میر نیرنگ کا سب سے زیادہ یقین ہے اس لیے میں اپنی بدگمانی کو واپس لے کر آپ سے عذر کرتا ہوں۔ اب مجھے اس تگ و دو میں آپ سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

مخلص دیرینہ حسن نظامی[1]"

اس معذرت نامے کے جواب میں ۱۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو علامہ اقبال نے خواجہ صاحب کو جو خط لکھا وہ بھی پڑھنے کے قابل ہے:

"مخدوم و مکرم جناب خواجہ صاحب!

السلام علیکم

آپ کا خط کئی دن سے آیا رکھا ہے۔ مجھے مصروفیت رہی۔ اس وجہ سے جواب نہ لکھ سکا، معاف کیجیے گا۔ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ میر نیرنگ صاحب نے آپ کو خط لکھا ہے، جس نے آپ کو "بدگمانی کے گناہ" سے بچا لیا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

آپ کو معلوم ہے تقریباً دو سال ہوئے میں نے اُن اعتراضات کے جواب

---

[1] انوارِ اقبال۔ ص ۱۸۳

میں جو آپ نے مثنوی ''اسرار خودی'' پر کیے تھے، چند مضامین مسائلِ تصوف پر لکھے تھے جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسئلۂ وحدت الوجود ان معنوں میں کہ ذات باری تعالیٰ ہر شے کی عین ہے، قرآن سے ثابت نہیں اور روحانیت میں اسلامی تربیت کا طریق صحو ہے نہ کہ سکر۔ آپ ہی کے اخبار ''خطیب'' میں حضرت صوفی قاری شاہ سلیمان نے ان دونوں مسائل کے متعلق میرے حق میں فیصلہ صادر فرمایا۔ باوجود اس کے مجھے ہمیشہ اس بات کا تعجب رہا کہ آپ اور آپ کے احباب اس اختلاف کی وجہ سے مجھے کیوں دشمنِ تصوف سمجھتے ہیں؟ یہ اختلاف کوئی نئی بات نہیں بلکہ حضراتِ صوفیہ میں ایک عرصے سے موجود ہے۔ بہر حال جن خیالات کا اظہار میں نے اخبار ''وکیل'' میں کیا تھا، ان کی صحت و صداقت کا مجھے اب تک یقین ہے گو ان پر بحث کرنا کئی وجوہ سے غیر ضروری جانتا ہوں۔ عوام بلکہ خواص کو بھی ان اصولی امور میں کوئی دل چسپی نہیں اور نہ اس قسم کے مباحث اخباروں کے لیے موزوں ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ مولانا اکبر الہ آبادی نے (جن کا ادب و احترام میں اس طرح کرتا ہوں جس طرح کوئی مرید اپنے پیر کا احترام کرے) مجھے لکھا کہ یہ بحث غیر ضروری ہے۔ اُس دن سے آج تک میں نے ایک سطر بھی ان مباحث پر نہیں لکھی گو ذاتی فائدے کے خیال سے مطالعہ جاری رکھتا ہوں۔ اب جو مولوی ظفر علی خاں صاحب نے اخبار ''ستارۂ صبح'' میں یہ بحث دوبارہ چھیڑی تو بوجہ ان دیرینہ تعلقات کے جو میرے اور ان کے درمیان ہیں اور نیز اس وجہ سے کہ اس بحث میں مجھے کمال دل چسپی ہے، بعض لوگوں کو یہ بدگمانی ہوئی کہ ستارۂ صبح کے مضامین میں لکھتا ہوں یا لکھواتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے قلم سے ایک سطر بھی اس بحث پر نہ نکلی اور نہ میں نے مولوی صاحب موصوف کو کوئی مضمون لکھنے کی تحریک کی ہے، بلکہ پرائیویٹ گفتگو میں کئی امور میں میں نے اُن سے اختلاف کیا ہے۔ اس کے علاوہ میں تو اصولی بحث کو جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں

اخباروں کے لیے موزوں نہیں سمجھا، چہ جائیکہ کسی اور کو اس کے جاری رکھنے کی تحریک کروں۔ البتہ موجودہ مشائخ کے حالات پر لکھنے اور ہمدردانہ لہجے میں ان کے خیالات و رسوم کی تنقید کرنے سے قوم کو ضرور فائدہ ہوگا۔ اگر مولوی ظفر علی خاں یا آپ اس طرف توجہ کریں تو چشم ماروشن دل ماشاد۔ غرض کہ آپ کو میری نسبت بدگمانی کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اور اگر کسی وجہ سے بدگمانی ہو بھی گئی تھی تو آپ مجھ سے براہِ راست دریافت کر سکتے تھے۔ لوگ تو اس قسم کی باتیں اڑایا ہی کرتے ہیں۔ دو چار روز کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے بیان کیا کہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اقبال نے اپنی ٹوپی ہمارے قدموں پر رکھ کر ہم سے معافی مانگی ہے اور آئندہ کے لیے توبہ کی ہے۔ میں نے انھیں یہ جواب دیا کہ جن لوگوں کے عقائد و عمل کا ماخذ کتاب و سنت ہے، اقبال ان کے قدموں پر ٹوپی کیا سر رکھنے کو تیار ہے اور ان کی صحبت کے ایک لحظے کو دنیا کی تمام عزت و آبرو پر ترجیح دیتا ہے لیکن جو بات خواجہ حسن نظامی کی طرف منسوب کرتے ہو تو اس کے لغو ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ اگر آپ چاہیں تو یہ خط شائع کر سکتے ہیں۔ والسلام

محمد اقبال۔ از لاہور[1]"

اس مراسلت کے بعد خواجہ حسن نظامی نے ایک مضمون اپنے ہفت روزہ اخبار "خطیب" میں لکھا، جس کا عنوان تھا "جناب اقبال اور حسن نظامی" جس میں یہ اعلان کیا:

"گزشتہ ایام میں جناب شیخ اقبال صاحب بیرسٹر پی ایچ۔ ڈی اور حسن نظامی کے درمیان مسئلہ تصوف میں اختلاف واقع ہوا تھا۔ گفتگو آگے بڑھتی مگر ایک طرف تو جناب ڈاکٹر صاحب کو مولانا سید اکبر حسین صاحب الٰہ آبادی نے روکا

---

[1] انوارِ اقبال۔ ص ۱۸۴-۱۸۶۔

اور دوسری جانب مجھے بھی ممانعت فرمائی۔ میں حضرتِ اکبر کی ذات کو اپنا مرشدِ معنوی تصور کرتا ہوں، اس لیے گفتگو سے دست بردار ہو گیا اور خلقت کی اس شہرت کو برداشت کرتا رہا کہ حسن نظامی اقبال سے علمی بحث نہ کر سکا۔ کیوں کر بدنامی بہتر تھی اپنے رہنما کے روح کی عدم تعمیل ارشاد سے۔[۱]"

۱۹۳۵ء میں دہلی کے ہندو مسلمان اہلِ علم نے جناب سری رام آنجہانی مصنف خم خانۂ جاوید (متوفی ۵ مارچ ۱۹۳۰ء) کے مکان پر جمع ہو کر "غالب سوسائٹی" قائم کی اس کے صدر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نائب صدر پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی، خواجہ حسن نظامی اور لالہ دیش بندھو گپتا تھے۔ اور سیکرٹری میر محمد حسین مالک فرم زنگی قلم، آغا محمد اشرف نبیرۂ مولانا محمد حسین آزاد اور جناب عشرت رحمانی تھے۔ اس سوسائٹی نے ۱۵ فروری ۱۹۳۶ء کو دہلی میں پہلا "یوم غالب" بڑے وسیع پیمانے پر منایا۔ اراکین انجمن کے مشورے سے خواجہ حسن نظامی نے مقامی و بیرونی ہندو مسلم مشاہیر کو شرکت کی دعوت دی۔ اور ہندوستان کے علمی سرپرستوں اور والیانِ ریاست کو "غالب ڈے" کی امداد و اعانت کے لیے تار بھیجے۔ علامہ اقبال ان دنوں بیمار تھے۔ اس لیے خود تو بہ نفسِ نفیس تقریبات میں شریک نہ ہو سکے مگر انھوں نے اپنا الہامی پیغام خواجہ حسن نظامی کے نام بھیج دیا جو حسبِ ذیل تھا:

"جناب خواجہ صاحب! دو سال سے علیل ہوں:

سخن اے ہم نشیں از من چہ خواہی
کہ من با خویش دارم گفتگوئے[۲]

پیغام کے لیے مراقبہ کیا تو میرزا ہرگوپال تفتہ کی روح سامنے آئی اور دلی والوں کے لیے یہ دو شعر نازل کر کے غائب ہو گئی:

---

[۱] روزگار فقیر۔ حاشیہ ص ۱۰۶۔

[۲] پیام مشرق۔ ص ۶۹۔

دریں محفل کہ افسونِ فرنگ از خود بُرد اورا
نگاہے پردہ سوز آور دلے دانائے راز آور
مئے ایں ساقیانِ لالہ رو ذوقے نمی بخشد
زفیضِ حضرتِ غالب ہماں پیمانہ باز آور

زیادہ کیا عرض کروں۔ سوائے اس کے کہ دعاؤں کا محتاج ہوں۔ ہاں دلی کے پنڈتوں سے سلام کہہ دیجیے۔

محمد اقبال[1]"

۱۹۳۶ء میں خواجہ صاحب نے میلادی جنتری بابت ۱۳۵۵ ہجری شائع کی۔ اس میں انھوں نے جہاں اور بہت سی جدتیں پیدا کیں، وہاں بہت سے مشاہیر کے قلمی چہرے اپنے مخصوص انداز میں لکھے اور اپنے دوست اقبال کے قلمی چہرے میں نہایت پیار سے یوں رنگ بھرے:

"سرو قد، گندمی رنگ، پر تمکنت چہرہ، ڈاڑھی صاف، شاعر بھی ہیں۔ نثر نویس بھی ہیں۔ بیرسٹر بھی ہیں۔ سر بھی ہیں۔ لیڈر بھی ہیں اور پھر صاحبِ اقبال بھی ہیں آنکھیں ایسی نشیلی کہ ایک آنکھ میں حافظ کا میکدہ تو دوسری میں عمر خیام کا خم خانہ جسم پنجابی، دماغ فلسفی، خیال صوفی، دل مسلمان، پہلے شاعر بنے، پھر بیرسٹر ہوئے اور اب لیڈر ہیں۔ انگریزی زبان پر پورا قابو رکھتے ہیں لیکن انگریزیت کے قابو میں نہیں آتے۔ انگریز ان کو سمجھتا ہے اور انگریز کو یہ سمجھتے ہیں۔ اگر انگریز کو سمجھنا نہ جانتے تو نہ سر بنتے اور نہ گول میز کانفرنس میں نظر آتے، عربی بھی جانتے ہیں اور فارسی بھی جانتے ہیں۔ فارسی اتنی اچھی جانتے ہیں کہ اگر خاقانی اور انوری کے زمانے میں ہوتے تو دوسرے خاقانی اور انوری مانے جاتے۔ مسلک

---

[1] منادی دہلی ۲۱-۲۸ فروری ۱۹۳۶ء۔ غالب ڈے کی مکمل روداد میرے مضمون "عظمت غالب" مطبوعہ اقبال ریویو کراچی جولائی ۱۹۶۵ء میں ملاحظہ فرمائیے۔

حق پسندی، پیشہ علمی خدمت، مذہب مسلمانوں کی بہبودی، مزاج میں سنجیدگی، متانت اور استقلال، یعنی شاعر ہونے کے باوجود شاعرانہ تلون مزاجی نہیں ہے۔ دوسرے شاعروں کی طرح ان کی شاعری بھی عشق باز ہے لیکن ان کی شاعری کو گل و بلبل سے عشق نہیں ہے ان کی شاعری کو قوم اور وطن سے عشق کرنے میں لطف آتا ہے۔ انگریز کی نظر میں پسندیدہ ہیں۔ مسلمان کی نظر میں محبوب ہیں۔ ہندو کی نظر میں اپنی صاف بیانی کی وجہ سے غیر مرغوب ہیں۔ ان کی شاعرانہ قابلیت کو سوئی ہوئی قوم کو جگانا خوب آتا ہے۔ اگر یہ پیدا نہ ہوتے تو حالی کی شاعری کے گلشن میں کبھی بہار نہ آتی [1]"

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو حضرت علامہ اقبال اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ چنانچہ ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء کے "منادی" میں آپ کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے خواجہ حسن نظامی نے جو کچھ لکھا اس کے حرف حرف سے درد و غم کا اظہار ہوتا ہے:

"آج ۲۱ اپریل کی صبح کو دلی ریڈیو نے یہ الم ناک خبر سنائی کہ تمام اسلامی دنیا کے مسلمہ قومی شاعر نے، جنھوں نے ساری دنیا میں ترقی و زندگی کی لہر پیدا کر دی، اس دنیا سے انتقال فرمایا۔ یہ خبر نہ صرف دنیا بھر کے مسلمانوں کو غم گین کرنے والی ہے بلکہ تمام ایشیائی قوموں کو اس کا صدمہ ہوگا۔ کیوں کہ مرحوم اقبال ایشیا کی پرانی تہذیب کے حامی اور مددگار تھے، اس لیے ان کی وفات سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ مرحوم کا دل دادہ: حسن نظامی۔" [2]

اس کے بعد ۲۹ اپریل ۱۹۳۸ء کے منادی میں تحریر فرمایا:

"اقبال کی وفات کے وقت آخری الفاظ یہ تھے:

'میں موت سے نہیں گھبراتا میں مسلمان ہوں ہنسی خوشی موت کا استقبال کروں گا۔'

---

[1] میلادی جنتری ۷۵۔ ہجری۔ [2] منادی دہلی ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء

میرے دوست اور فلسفیانہ شاعری کے آفتاب جناب ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال صاحب نے جمعرات کے دن ۱۹ صفر ۱۳۵۷ھ صبح صادق کے وقت اس دنیا سے کوچ فرمایا۔ وہ چونکہ محب اہلِ بیت تھے اور تفضیلی عقائد رکھتے تھے، اس لیے قدرت نے ان کو چہلم سید الشہدا علیہ السلام سے ایک دن پہلے کی تاریخ عطا فرمائی۔

ہندوستان کے ہر باشندے نے چھوٹا ہو یا بڑا، اس صدمے کو قومی اور ملکی صدمہ محسوس کیا اور ہندوستان کے باہر بھی ایک تہلکہ برپا ہو گیا جس سے ان کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مرحوم جب تعلیم کے لیے یورپ جا رہے تھے تو درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ میں حاضر ہوئے تھے اور ایک نظم بھی نذر کی تھی۔ جس کے حسب ذیل اشعار بہت مقبول ہوئے تھے:

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربارِ گوہر بار سے
محوِ اظہارِ تمنائے دلِ ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہم نام ہوں[1]

اس سفر کے وقت مرحوم کے ساتھ میر نیرنگ صاحب وغیرہ شعرا بھی تھے جو سب جمع ہو کر میرزا غالب کے مزار پر گئے تھے اور میں نے دلی کے مشہور قوال ولایت خاں کو بلایا تھا۔ ولایت خاں اس وقت نو عمر لڑکا تھا۔ سر محمد اقبال نے غالب کی لوحِ مزار کو دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لے کر سر جھکا لیا تھا اور ولایت خاں نے غالب کی یہ غزل گائی تھی:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

---

[1] خواجہ محمد اقبالؒ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ایک مقبول خدمت گذار کا نام تھا۔ ان کے نام کی طرف اس نظم میں اشارہ کیا ہے۔

اس شعر کو ولایت خاں نے اس طرح ادا کیا تھا کہ سب پر ایک کیفِ الم طاری تھا۔ مگر آج جب اقبال کے مرنے کی خبر آئی تو اس ولایت خاں قوال نے: "جواب بوڑھا ہوگیا ہے" دلی ریڈیو میں خود اقبال کی ایک غزل گائی اور ایسے درد انگیز لہجے میں کہ سب سننے والے لوگ رونے لگے۔

آج رات کو پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے۔ نے دہلی ریڈیو میں مرحوم اقبال کی نسبت ایک بہت اچھا مضمون سنایا تھا جس کے بعد ریڈیو والوں نے خبریں سناتے وقت کہا کہ مرحوم اقبال نے اپنے قدیمی خدمت گذار نوکر علی بخش کی گود میں جان دی۔ یہ سن کر مجھ پر بہت اثر ہوا اتنا اثر جو گورنر پنجاب اور سر ٹیگور اور صدر کانگریس اور مسٹر جناح کے بیانات سے بھی نہیں ہوا تھا۔ کیوں کہ آقا اور نوکر کی یہ وفاداریاں اور باہمی الفتیں اب خواب و خیال ہوگئی ہیں۔ ہر چیز میں ظاہر داری اور نمائش ہوتی ہے۔ دلی تعلق بہت کم ہوتا ہے۔ پس مجھ پر اثر اس لیے ہوا کہ اقبال سچ مچ ہماری مٹنے والی تہذیب کی ایک نشانی تھے جن کے مستقل طرزِ عمل اور برتاؤ نے ان کے نوکر علی بخش کو ایسا گرویدہ کر لیا تھا کہ وہ آخر وقت تک ساتھ رہا۔ اس لیے میں نے تعزیت نامہ علی بخش کو بھیجا ہے۔ مرحوم کی اولاد کو نہیں بھیجا۔ اولاد کے پاس میں خود ماتم پُرسی کرنے جاؤں گا۔ اس وقت تو خطاب کے قابل میں نے علی بخش نوکر کی محبت دیکھی کیوں کہ میرے کان میں اقبال کی آواز گونج رہی تھی: "علی بخش حقہ بھر لا۔ اندر سے جاوید کو لا۔ خواجہ صاحب سے ملا۔

اقبال کے مرنے سے ہندوستان ہی سونا نہیں ہوگیا بلکہ ایشیا بھر میں اندھیرا چھا گیا۔ ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال تمام ایشیا کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں۔ جنھوں نے اقبال کی قدر کی تھی اور پانچ سو روپے ماہوار پیش کرتے تھے۔ امید ہے کہ مرحوم کے اہل و عیال کو بھی نواب صاحب فراموش نہیں کریں گے۔

حسن نظامی ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء[1]

---

[1] منادی دہلی ۲۹ اپریل ۱۹۳۸ء۔

علامہ اقبال نے جس آزاد اسلامی مملکت کا تخیل پیش کیا تھا، ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اور اہلِ پاکستان نے اس مفکرِ اعظم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے "یوم اقبال" پہلے سے زیادہ شان دار طریق پر منانا شروع کیا۔ ۱۹۵۲ء میں خواجہ حسن نظامی صاحب کو بھی لاہور میں ہونے والے "یوم اقبال" میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے لاہور آنا تو خوشی سے قبول کر لیا لیکن بیماری اور ضعف کے سبب وہ سفر اختیار نہ کر سکے۔ اس لیے انھوں نے اپنا مضمون لکھ کر لاہور میں اپنے خلیفہ جناب محمد حسین نظامی کو بھیج دیا کہ وہ اسے طبع کرا کے جلسے میں تقسیم کر دیں۔ یہ مضمون علامہ اقبال کے متعلق خواجہ صاحب کی آخری تحریر ہے اور اس لحاظ سے نہایت قیمتی ہے کہ اس میں انھوں نے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے اور نہایت فراخ دلی سے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اپنے تمام مریدوں اور عقیدت مندوں کو اقبال کے کلام کی روح پر متوجہ رہنے کی تلقین کی ہے:

"لاہور کے یومِ اقبال کی خبر سن کر میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ خود لاہور آؤں اور یوم اقبال میں اپنا یہ مضمون پڑھوں مگر بڑھاپے اور بیماری اور بینائی کی خرابی کے سبب لاہور کا سفر نہ کر سکا۔

گزشتہ سال دہلی میں پاکستانی ہائی کمشنر صاحب نے میری صدارت میں یوم اقبال کا جلسہ کیا تھا۔ جہاں اسلامی دنیا کے سفیر بھی موجود تھے اور پنڈت زار صاحب اور ان کے فرزند پنڈت گلزار صاحب وغیرہ ہندوؤں نے بہت اچھی تقریریں کی تھیں اور نظمیں سنائی تھیں۔ اور میں نے اپنی صدارتی تقریر میں مصر کے سفیر کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ سر محمد اقبال مرحوم کشمیری برہمن تھے اور کشمیری برہمنوں کا تعلق مصر سے ہے کیوں کہ مصر میں سورج کے مندر کے بڑے پجاری مہنت ہری ہر تھے اور مصری زبان میں سورج کو "را" کہتے ہیں۔ قرآن شریف کی سورۂ یوسف بھی "الف لام را" سے شروع ہوتی ہے یعنی را کا لفظ خدا تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا ہے۔

مہنت ہری ہر کی شادی قبطی فرعون کی لڑکی سے ہوئی اور فرعون لاولد مر گیا تو مہنت ہری ہر کو فرعون بنا دیا گیا اور ان کی اولاد چار سو برس تک مصر پر حکومت کرتی رہی اور نئے انقلاب کے سبب نیا خاندان حاکم ہو گیا اور ہری ہر کی اولاد حضرت موسیٰ کی یہودی قوم کے ساتھ مصر سے نکلی۔ حضرت موسیٰ فلسطین چلے گئے اور ہری ہر کی اولاد افغانستان میں آ گئی۔ یہاں اس نے ہری نام کا ایک شہر آباد کیا جس کو بعد میں ہرات کہنے لگے۔ اس کے بعد یہ لوگ کشمیر میں آئے اور کشمیر سے ہندوستان میں آئے اور گنگا کے کنارے اپنے مورث کے نام پر ہری دوار تیرتھ بنایا۔

لہٰذا ہندوستان کے کشمیری برہمن سب مصری ہیں اور چونکہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی کشمیری برہمن تھے، اس لیے اقبال بھی مصری تھے اور نہرو جی بھی کشمیری برہمن ہونے کے سبب مصری ہیں۔

میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے میرے تعلقات اتنے زیادہ تھے کہ وہ بار بار دہلی میں میرے پاس آتے تھے اور میں بار بار ان کے پاس جاتا تھا۔

وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو متحد کر کے کل جہان میں پاکستان بنانا چاہتے تھے اور ان ہی کی تحریک سے میں نے ۱۹۱۱ء میں مصر، فلسطین، شام اور حجاز کا سفر کیا تھا اور واپس آ کر میں نے اقبال سے کہا تھا کہ مذکورہ ملک انگریزی تہذیب کے اس قدر دلدادہ ہو گئے ہیں کہ مجھے وہاں اسلامی اتحاد کی امید نظر نہیں آتی۔

اس کے بعد اقبال نے مثنوی "اسرار خودی" لکھی اور حضرت حافظ شیرازی کے کلام پر اور بعض صوفیوں کے عقائد ترکِ دنیا پر تنقید کی، جس کو میں نے اور حضرت اکبر الہ آبادی نے ناموزوں خیال کر کے اس سے اختلاف کیا اور کچھ عرصے تک اخبارات میں اختلافی مضامین شائع ہوئے۔ آخر کار میرا ان کا اتحاد خیال ہو گیا اور میں نے تسلیم کر لیا کہ ترکِ دنیا کا وہ تخیل جو بعض صوفیائے کرام

کا ہے، وہ وقتِ حاضر کے لیے موزوں نہیں ہے کیوں کہ قرآن میں خدا نے جو دعا سکھائی ہے اس میں دنیا کی بھلائی کو مقدم اور آخرت کی بھلائی کو موخر رکھا ہے۔

اس کے بعد میں نے دہلی کے پاکستانی یوم اقبال میں کہا تھا کہ میرے مریدوں کی غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے کہ میری اور اقبال کی صفائی اور صلح ہو گئی تھی اور ہم دونوں میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے میرے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی شان میں کئی قصیدے لکھے تھے اور قصیدے میں یہ شعر تھا:

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربارِ گوہر بار سے

اور اسی قصیدے میں حضرت کے خادمِ خاص خواجہ محمد اقبال صاحب کی نسبت ایک شعر تھا:

محوِ اظہارِ تمنائے دلِ ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہم نام ہوں

اور یہ شعر بھی تھا:

جا ہی پہنچے گی صدا لاہور سے دہلی تلک
منہ چھپا کر مانگتا ہوں تجھ سے وہ سائل ہوں میں
بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں ہم کو

سوامی شردھانند کی تحریک شدھی اور میری جوابی تحریک تبلیغ کے ایام میں لاہور کے لالہ لاجپت رائے صاحب نے مظفر پور بہار کے جلسے میں کہا تھا کہ ہندو قوم کا ہاضمہ قوی ہے۔ وہ یونانی سکندر کے ساتھیوں کو ہضم کر گئی اور اب ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی ہضم کر جائے گی۔ اس کے جواب

میں پٹنہ جاکر میں نے تقریر کی تھی کہ لالہ لاجپت رائے صاحب اپنے دعوے کا ثبوت پیش کریں اور میں اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرتا ہوں کہ مسلمانوں کا ہاضمہ بہت مضبوط ہے۔ جو کشمیری برہمن اقبال کو ہضم کر گئے اور راجپوت قوم کے میاں سر فضل حسین کو ہضم کر گئے۔ اس تقریر کو اخباروں میں پڑھ کر جو خط سر اقبال نے مجھے لکھا تھا وہ آج تک موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس جواب سے بہت خوش ہوئے تھے۔

آخر میں مجھے یہ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مرحوم ایسا پاکستان چاہتے تھے جو یورپ کی تہذیب کے ہر اثر سے پاک ہو۔ لہٰذا پاکستان کے مسلمانوں کو اقبال کے اس خیال پر غور کر کے اپنے حالات کا اندازہ کرنا چاہیے کہ وہ یورپ کی تقلید سے کتنے آزاد ہیں۔

لاہور میں ایسے اصحاب موجود ہوں گے جن کو شاید یاد ہو کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسے میں اقبال نے اپنی نظم سنائی تو میں نے اپنے سر کا عمامہ اتار کر اُن کے سر پر رکھ دیا تھا۔ اور کہا تھا:

تمھارے جام مے کی نذر میری پارسائی ہو اور اقبال کی نظم اور میرے خیالات اور میرے عمل کا حاضرین پر بہت اثر ہوا تھا۔

میرا مقصد اس تحریر سے یہ ہے کہ میری موت کا وقت قریب ہے اور ممکن ہے کہ میرے بعد میرے مریدوں میں یہ غلط فہمی باقی رہے کہ مجھ میں اور اقبال میں بعض مسائل تصوف کے سبب اختلاف تھا اس لیے میں لاہور کے جلسۂ عام میں اعلان کرتا ہوں کہ مجھ میں اور اقبال میں کسی قسم کا اختلاف باقی نہ رہا تھا اور میں آج تک اقبال کے ان خیالات کا حامی ہوں جو انھوں نے بعض اہلِ تصوف کے خیالاتِ ترکِ دنیا کے خلاف ظاہر کیے تھے۔

میں پاکستانی مریدوں اور دوستوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اقبال کے کلام کی روح پر متوجہ رہیں اور قرآن کے اس حکم کو سامنے رکھیں

جس میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے:

ولا تنس نصیبک من الدنیا (اے انسان! مت بھول اپنے دنیاوی حصے کو) اقبال کے کلام میں دنیا کے حصے کو حاصل کرنے کے ساتھ ہی یورپ کے منکر دین حصے سے بچنے کی تلقین بھی ہے۔"[1]

خواجہ حسن نظامی جو ۲ محرم ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۸۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنی خداداد صلاحیتوں اور زبان دانی کے فطری جوہر دکھا کر ۱ ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء میں اپنے اللہ کو پیارے ہو گئے اور وہ اردو کے صاحب طرز ادیب بلکہ اپنے رنگ کے فرزند وحید تھے۔ ان کی سبق آموز اور زندگی افروز تحریروں سے پاک و ہند نے بہت کچھ حاصل کیا۔ عوام نے ان کی رنگین بیانی اور شگفتہ سرائی سے لطف اٹھایا تو خواص نے زبان کے چٹخارے کے ساتھ حکمت و تصوف کے گہر ہائے گراں مایہ سے اپنے جیب و دامن بھرے۔ علامہ اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے ۱۹۶۴ء میں "یوم حسن نظامی" کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے فرمایا:

"علامہ اقبال کے حضرت خواجہ حسن نظامی سے گہرے مراسم تھے۔ بلکہ ان کی ذات سے خاص محبت تھی۔ ایک دو بار جب میں علامہ کی معیت میں دہلی گیا تو حضرت، نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر حاضری دینے کے بعد مجھے حضرت کے ہاں لے گئے۔ بچپن میں مجھے حضرت کی تصانیف پڑھنے کی ترغیب بھی علامہ ہی نے دی۔ مجھے خوب یاد ہے جب میں حضرت کی تصانیف میں مغل شہزادیوں کی مفلوک الحالی کے متعلق پڑھا کرتا تھا تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے علامہ سے ذکر کیا کہ حضرت کا انداز تحریر غیر معمولی طور پر موثر ہے۔ فرمانے لگے کہ حضرت دردمند ہیں اور ہر دردمند کا انداز تحریر موثر ہوا کرتا ہے۔

---

[1] ادبی دنیا، لاہور مئی ۱۹۰۵ء، ص ۹-۱۱۔

مجھے ابھی تک حضرت کا چہرہ یاد ہے۔ دراز گیسو، شفقت بھری نگاہیں اور شخصیت سادگی و عجز کی ایک نادر مثال۔ ہر وقت مسکراتے رہتے۔ مجھے فخر ہے کہ میرے سر پر اس بزرگ ہستی کا دستِ شفقت رہا ہے اور میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے ان کا ذکر چھیڑ کے ایک پرانی یاد تازہ کر دی۔[1]"

یہ ہے مختصر سی جھلک ان بزرگ ہستیوں کی دوستی کی، جو الفت و یگانگت کے رشتوں میں جکڑی ہوئی تھیں اور جن کے مخلصانہ اور بے غرضانہ تعلقات چالیس سال کی طویل مدت میں پھیلے ہوئے تھے۔ وفا کی سطح سے گری ہوئی دنیا میں غرض کے بندے تو بے شمار ملیں گے مگر ایسی مثالیں کم ہی نظر آئیں گی:

دلِ غم دیدۂ انجام لرز جاتا ہے
اب جو دو شخص بہم عہدِ وفا کرتے ہیں

---

[1] ادبی دنیا، لاہور، جولائی ۱۹۶۵ء، ص ۷۳۔

جمیل مہدی

حضرت خواجہ حسن نظامی ـ ایک ادیب

یکم اگست ۱۹۵۵ء کو پیر کے دن خواجہ حسن نظامی اس دنیا میں نہیں رہے۔ انھوں نے اس جہان کا سفر شروع کر دیا جہاں کا سفر نامہ وہ کبھی نہ لکھ سکیں گے جہاں سے وہ کبھی لوٹ کر نہ آ سکیں گے۔ ہر انسان کا خواہ وہ کتنا ہی بلند ہمت، شہزور اور طاقت ور ہو، یہی انجام ہے کہ وہ موت کے سرد اور بے رحم ہاتھ کے سامنے بے بس ہو جائے۔ ایک جیتی جاگتی، ہنستی کھیلتی اور گنگناتی ہوئی زندگی، خاموش اور بے حرکت جسد میں تبدیل ہو جائے۔ سرد ہو کر مٹی میں مل جائے۔

انسان بہ حال فانی ہے، اسے موت کے اندھیرے میں گم ہو جانے سے، بے نام ونشان ہو جانے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ لیکن انسان کا کردار لافانی ہے اور انسان کی یہی چیز ایسی ہے جس کے سامنے موت بھی عاجز ہو کر سرنگوں ہو جاتی ہے۔

خواجہ صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ جب تک وہ زندہ تھے، اُن کی موت کا دھڑکا اور تشویش ان کی ذات کے ساتھ وابستہ تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو فنا کی آغوش میں دے دیا تو وہ لافانی بن گئے۔ اب ان کا نام نسلوں تک اور ان کا کام ہمیشہ انسانوں کے ساتھ رہے گا۔

خواجہ صاحب کی زندگی، جد و جہد، رستاخیز، کش مکش اور نبرد آزمائی کی زندگی ہے وہ اس دور کی زندگی ہے جہاں حسن ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور سنگین حقائق راستہ

روک لیتے ہیں۔ ان کی زندگی میں یک رنگی اور یکسانیت نہیں ہے۔ وہ بڑی پہلودار اور بھرپور شخصیت تھے۔ بالکل سورج کی مانند، جس سے نکلنے والی لاتعداد کرنیں یک رنگ ہونے کے باوجود بوقلموں اور رنگارنگ ہوتی ہیں۔ وہ صوفی تھے۔ درویش تھے۔ مترجم قرآن تھے۔ صحافی اور ادیب تھے۔ تاجر پیر تھے۔ اتنے پہلو جب کسی ایک ذات میں گڈمڈ ہو جائیں تو بڑی صبر آزما مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ انھیں چھانٹنے اور الگ الگ کرنے میں، پرکھنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔

ان کی زندگی اول سے آخر تک تجربہ رہی۔ انھوں نے زندگی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے، اس کے ساتھ نبرد آزمائیاں کیں۔ کاٹے کاٹے، سمجھوتے کیے۔ وہ ہارے کبھی نہیں، دل برداشتہ بھی کبھی نہیں ہوئے، بلکہ استقلال اور سلیقے کے ساتھ تعمیر میں لگے رہے۔ زندگی کے ساتھ ان کی مکمل مفاہمت تھی۔ ان کی شخصیت بنیاد سے چھت تک خود ان کی تعمیر کردہ تھی اس کی ایک ایک اینٹ انھوں نے خود رکھی تھی۔ اس وقت سے لے کر کہ وہ ایک معمولی انسان کی مانند گلیوں میں کتابیں فروخت کرتے تھے، اس وقت تک کہ ان کی نگاہ کے اشارے پر زندگیوں کے فیصلے ہونے لگے۔ وہ اپنے معمار آپ تھے۔ ایسی شخصیتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔

خواجہ صاحب کی ابتدائی زندگی بڑے سنگلاخ، بڑے صبر آزما اور بڑے حوصلہ فرسا ماحول میں بسر ہوئی لیکن انھوں نے کبھی ضبط اور ہمت کا سر رشتہ نہیں چھوڑا۔ انھوں نے اسی زندگی سے ہمیشہ سبق حاصل کیا۔ اسی زندگی نے انھیں ایک نقاد کی نگاہ دی اسی زندگی کی بدولت انھوں نے اپنی سمت اور راستے کا تعین کیا، وہ ہمیشہ اس زندگی کے تجربے سے اس کے دیے ہوئے سلیقے سے فائدہ حاصل کرتے رہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو آگ اور شعلوں میں جلنے کے بعد راکھ کے بجائے فولاد بن کر باہر نکلتے ہیں۔ میر نے کہا تھا:

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

لیکن خواجہ صاحب نامرادانہ زیست کرنے کے قائل نہیں تھے۔ یہ نامرادانہ زیست جو انھیں اپنے خاندان سے اور ان کے دور کو پیچھے دورسے ورثے میں ملی تھی انھیں کبھی

پسند نہیں آئی۔ انھوں نے اسے کامراں اور بامراد زندگی کے روپ میں ڈھالنے کے لیے بڑی جاں کاہ جدوجہد سے کام لیا۔ وہ عزم اور استقامت کے ساتھ ایک نصب العین کے ماتحت جدوجہد میں لگے رہے اور کامیاب ہو کر ہی مطمئن ہوئے۔ تصوف اور ادب کے میدان ان کی جولانگاہ تھے۔ لیکن ان دونوں میدانوں کو انھوں نے کھیتوں میں تبدیل کرنا کبھی پسند نہیں کیا بلکہ اپنی بہتر صلاحیتوں سے کام لے کر زندگی گذارنے کے لیے اور دوسری سمتوں میں کوشش کی۔ وہ قلمی مزدور کبھی نہیں بنے۔ شاید اسی لیے ان کی تحریر میں شگفتگی، اخلاص کی گرمی اور وہ سفاکی تاثیر آخیر تک برقرار رہی جو عظیم ادب کی تشکیل کرتی ہے۔

خواجہ صاحب کا قلم بڑا سحر طراز قلم تھا۔ وہ اس دور کے ان ساحروں میں سے ایک تھے جن کے ناموں کی شمولیت کے بغیر اردو کی ادبی اور شعری تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لحاظ سے ان کا نام داغ، اقبال، محمد حسین آزاد، شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے جو کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہے۔ ان میں آپ بیتی، سفرنامے، روزنامچے، افسانے، خطوط، ادبی مضامین، مغلیہ سلطنت کے دور زوال اور انحطاط کی داستانیں، قرآن کا ترجمہ سبھی کچھ شامل ہیں۔ ان کے ہاں زبان و بیان اور خیال کے علاوہ شاذ ہی کوئی نئی چیز نظر آتی ہے، لیکن اسلوب اور کہنے کا انداز ایسا ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں "مصور فطرت" بن گئے تھے۔ ایک فن کار کی سب سے بڑی عزت یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں کلاسیکل بن جائے۔

ان کی تحریر میں محمد حسین آزاد کا سا جوش خروش، مدوجزر اور والہانہ انداز بھی نہیں تھا، نہ ہی وہ شبلی کی مانند بھاری گمبھیر اور متانت سے بھرپور تحریر تھی۔ نہ ہی مولانا ابوالکلام آزاد جیسا رزمیہ انداز اور پہاڑوں سے گرتے ہوئے آبشار کا پر جلال اس کے اندر پایا جاتا تھا۔ پھر بھی وہ اردو کے بہت بڑے نثر نگاروں میں سے ایک تھے۔ ان کی تحریر میں یکسانیت حلاوت، نغمہ شیرینی اور سوز کا ایسا امتزاج پایا جاتا تھا جو سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں اتر جاتا تھا۔ اپنی اس تحریر کے متعلق انھوں نے

خود لکھا تھا۔

"اگر کوئی شخص تنقید کی نظر سے میری کتابوں کو دیکھے گا تو اس کو ایک حیرت خیز بات محسوس ہوگی کہ میں نے بہت محدود الفاظ سے یہ سب کام کیے ہیں۔ یعنی میری زبان پر گنتی کے چند الفاظ چڑھے ہوئے ہیں۔ ان ہی سے میں نے کام لیا اور ہر قسم کے مضامین ادا کر دیے۔ الفاظ کی وسعت میرے ہاں نہیں ہے اور حافظہ درست نہ ہونے کے سبب مجھ کو مقررہ و معلومہ الفاظ کے سوا ادائے مطلب کے وقت اور کوئی لفظ یاد نہیں آتا اور میں اپنے انہی محدود الفاظ سے ہر مطلب کو ادا کر دیتا ہوں۔" (آپ بیتی)

اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنی تحریر میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں، ان کی تعداد حیرت ناک حد تک کم ہے۔ لیکن اسٹائل کی ندرت اور لہجے کی بے ساختگی اس کمی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ وہ جو بات کہتے ہیں حشو و زوائد سے پاک اور براہِ راست ہوتی ہے۔ انھوں نے سینکڑوں دعائیہ شذرے لکھے۔ صحافتی مضمون تحریر کیے۔ کافی ضخیم کتابیں بھی ان کے قلم سے نکلیں۔ لیکن ان کا لہجہ کبھی پست و بلند نہیں ہوتا۔ وہ کہیں دور بجتی ہوئی بانسری کی مانند ہمیشہ اضطراب انگیز، یکساں اور دل نشیں رہتا ہے۔ ان کی تحریر میں وہ افسردگی ہے جو کہر آلود فضا میں عبادت خانوں پر طاری ہو جاتی ہے لیکن وہ اطمینان بھی ہے جو عبادت گذاروں کے دل میں نظر آسکتا ہے۔

انھوں نے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ لیکن عوام میں اُن کی شہرت "غدر دہلی" کے واقعات اور بیگموں اور شہزادوں کے مصائب کی داستانوں کے ذریعے ہوئی۔ ان کے اس قسم کے مضامین بڑے اندوہناک، بڑے پرسوز اور بڑے اثر انگیز ہیں، ان کی اثر انگیزی اور دل نشینی کا باعث وہ رومان ہے جو ماضی کی یاد اور کسی بڑے طبقے یا قوم یا گذری ہوئی مصائب کی داستانوں میں پوشیدہ ہوتا ہے اس رومان نے ہماری مذہبی و دینی شخصیتوں کو عظیم اور لافانی بنا دیا ہے۔ انیس کے مراثی، حالی کا مسدس اور شبلی کی تاریخیں سب اسی رومان کے باعث مشہور اور مقبول ہوئے تھے۔

خواجہ حسن نظامی کو بھی انقلاب ۱۸۵۷ء کے افسانوں اور اس انقلاب کے باعث پھیلنے والے تہلکے پر، دتی کی بکھرتی، برباد ہوتی ہوئی آٹھ آٹھ آنسو روتی ہوئی معاشرت پر حکمراں خاندان کی عبرتناک تباہی پر لکھی ہوئی تحریروں نے عوام میں ہر دل عزیز اور مقبول بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ "غدر دہلی کے افسانے" اور "بیگمات کے آنسو" وہ کتابیں ہیں جو اب سے دس پندرہ برس پہلے تک تقریباً ہر گھر میں دکھائی دے سکتی تھیں۔

ان کی یہ مقبولیت، یہ شہرت کچھ زیادہ قابلِ وقعت اور ٹھوس نہ ہوتی، اگر اس کی بنیاد محض ایک قدرتی موت مرتے ہوئے، تکلیف سے بلبلاتے اور چیختے ہوئے طبقے اور سماج کی نمائندگی اور منظر کشی پر ہوتی۔ مصائب اور آلام سے بھرپور زندگیوں کے افسانے یقیناً رحم اور عبرت کے جذبات انسانوں کے دلوں میں پیدا کرتے ہیں لیکن یہ تاثر، غمگینی کا یہ احساس، رحم کا یہ جذبہ دیرپا نہیں ہوتا، وہ شخصیت کو دل کش ضرور بناتا ہے لیکن ہمیشگی نہیں بخش سکتا۔ لافانی نہیں بنا سکتا۔

اگر خواجہ صاحب محض "غدر دہلی کے افسانے" اس "غدر" کے باعث پیدا شدہ تباہی اور شہزادوں اور بیگموں کی تاراجی اور بربادی کی داستانیں لکھنے پر ہی اکتفا کرتے تو ان کا نام تب بھی باقی رہتا لیکن انھیں وہ عظمت اور ہمہ گیری کبھی حاصل نہ ہوسکتی جو ایک فن کار کو عظیم اور ناقابلِ فراموش بنا دیتی ہے۔ انھوں نے مرثیہ اور ماتم سے الگ ہٹ کر جو مضامین لکھے ہیں، اُن کی شخصیت انھیں سے تعمیر ہوئی ہے۔ ان سے پہلے اردو کے پاس آنکھ نہ رہی تھی۔ دوررس نظریں اور مشاہدے کی طاقت بھی تھی لیکن خوردبین نہیں تھی۔ یہ خوردبین اردو کو خواجہ صاحب نے عطا کی اور یہ ان کا احسان ہے۔

انھوں نے عظیم اور بھاری موضوعات کو نہیں اپنایا بلکہ ایک حد تک ان سے اغماض برتا ہے۔ انھوں نے بڑے بڑے مسائل پر بھی قلم طرازی نہیں کی بلکہ ایک حد تک وہ بڑے مسائل سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ ان کی نظریں آنسو، لیمپ، مٹی کا تیل، دیا سلائی، کھٹمل، ہچکی، مچھر، الو، مکھی، اڈرس، لالٹین، جھینگر، لپیٹ، قٹ بال اور سوئی جیسے بے حقیقت اور نظری موضوعات پر ٹھہرتی ہیں۔ وہ ان پر طبع آزمائی کرتے ہیں اور طبع آزمائی کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

ان کے فکر و ذہن کے بعید تر گوشوں پر تصوف کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اس سے اُن کی تحریر پر بھی اول سے آخر تک تصوف اور روحانیت کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ کوئی موضوع ہو کوئی بات ہو وہ اس صوفیانہ روش ترک نہیں کرتے۔ ان کا ذہن ہر وقت بصیرت کے گوشے اُلٹنے اور عبرت کا سامان فراہم کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ بے حقیقت سی بے حقیقت چیز کا وہ تذکرہ کریں گے لیکن اس میں کوئی نہ کوئی نصیحت کوئی نہ کوئی اخلاقی پند، کوئی نہ کوئی روحانی نکتہ ضرور پیدا کر دیں گے۔ مچھر۔ الو۔ مکھی۔ جھینگر، کھٹکہ، سوئی اور چھکڑا کی گاڑی اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

ان ہی پیش پا افتادہ مضامین اور موضوعات کی جانب زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی وجہ سے ان کی تحریروں میں ماحول اور زمانے کی دھڑکن سنائی نہیں دیتی۔ ترکان احرار، گاندھی جی، شاہ جارج، دربار دہلی، کانپور کا ہنگامہ، شیخ سنوسی اور ایسے ہی دو چار واقعات اور شخصیتیں ان کے مضامین میں سے نکال دیے جائیں تو انھیں کسی بھی دور کے ساتھ ملا کر پڑھا جا سکتا ہے۔ (سفرنامے ان کے علاوہ ہیں)

وہ جس دور میں پیدا ہوئے تھے وہ کش مکش، تصادم اور سرکشی کا دور تھا۔ ایک کہنہ اور سال خوردہ دور ختم ہو چکا تھا، دوسرے کی ابتدا ہو رہی تھی۔ ایک تہذیب مر چکی تھی دوسری پیدا ہو رہی تھی۔ ایک معاشرت نے اپنی سانس پوری کر لی تھی، دوسری معاشرت جنم لے رہی تھی۔ چاروں طرف حیرانی چہ کنم اور شسشدری کا زور دورہ تھا۔ اسی لیے ان کے ذہن میں بھی اسی ٹکراؤ، اسی کش مکش اور اسی ہنگامے کے آثار دکھائی دیتے ہیں جو اس وقت ذہنوں کے باہر برپا تھا۔ ان کی تربیت میں، وراثت میں ملی ہوئی ذہنیت، ایک پرانے لیکن حکمراں جاگیردارانہ نظام کے تقاضے، اس کی برکتیں، اس کی نحوستیں سب شامل تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بڑی بڑی عشرت گاہیں سنسان ہو گئی تھیں۔ شبستانوں میں ہل چل گئے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے عیش کے تمام دروازے یک یک کرکے بند ہو گئے تھے اور جہنم کا پھاٹک کھل گیا تھا۔ ایسے رفتہ عیش کی متاع گمشدہ کے حصول کی تمنا ان کی قدرتی تمنا تھی، یہ ان کی تمنا نہیں تھی بلکہ اس مخصوص طبقے کی تمنا تھی جس کے درمیان وہ سانس لے رہے تھے لیکن اپنی ذہنی و قدرتی

بصیرت کے باعث وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ زمانے کا برق رفتاری سے گھومتا ہوا پہیہ انسانی ہاتھوں سے نہیں روکا جاسکتا۔ ایک گرتی اور منہدم ہوتی ہوئی عمارت بلیوں کے سہارے پائیدار نہیں بن سکتی۔ اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ اب انسانوں کی نظریں لہلہاتے ہوئے نرم سبزہ زاروں اور جھومتے اور مسکراتے ہوئے نازک پھولوں کے بجائے زمین کی اس خودرو اور قدرتی پیداوار کی جانب متوجہ ہوں جو زیادہ دیر تک عمل اور جد وجہد کی ستیزہ کاری میں ٹھیر سکے۔ حقائق سے سامنا کرتے ان سے آنکھ ملانے کا یہ احساس یہ جذبہ اُن کے ہاں بہت سی تحریروں پر ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کی مثال اس ٹکڑے سے سمجھی جاسکتی ہے:

"کیکر کی چھال مفید ہے، جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں اور مختلف رنگ تیار ہوتے ہیں۔ کیکر کی لکڑیاں جلنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں۔ کیکر کی پتیاں بکریاں کھاتی ہیں اور آدمی کو دودھ دیتی ہیں۔ کیکر کی پھلیاں بھی چارہ اور رنگ بنانے میں کام آتی ہیں۔

یہ میاں گلاب کس مرض کی دوا ہیں۔ پیٹ میں درد ہو تو گلقند کھاؤ۔ ہیضہ ہو جائے تو گلاب پلاؤ، مر جاؤ تو قبر پر چڑھاؤ۔ اور بھی کوئی کام اس منحوس وجود سے نکلتا ہے؟

کیکر کا پھول گلاب کے پھول سے لاکھ درجہ اچھا، گلاب کا پھول ایک دن کی تیز دھوپ میں کمہلا اور مرجھا جاتا ہے اور کیکر کا پھول ہفتوں سورج کا مقابلہ کرتا ہے اور آج کل تعریف اسی کی ہے جو دشمن کے مقابلے میں دیر تک زندہ رہے۔"

(گلاب تمہارا کیکر ہمارا)

بدلتے ہوئے زمانے کا یہ عرفان اور اس کی سمت پہچاننے کا یہ ثبوت اور بھی کتنی ہی جگہ ملتا ہے لیکن ان کا ذہن تبدیلیوں کا، جاگیردارانہ نظام کی شکست کا، ایک نئے اور رفاہانہ بے پروائی سے بڑھتے ہوئے دور کے تقاضوں کا صحیح طور پر مشاہدہ کرنے کے باوجود اسے

ہشاش بشاش ہوکر قبول کرنے، اس کا استقبال کرنے سے گریزاں نظر آتا ہے۔ ان کے ذہن میں وہ مشرقیت اپنے پورے رچاؤ کے ساتھ موجود تھی جو اپنی لچک، بہتر صفات اور قابلِ قدر انسانی خصوصیات کے باوجود "وضعداری" کی اتنی پابند ہے کہ اس کے تحفظ کی خاطر پہاڑوں سے ٹکرا جانا کھیل سمجھا جاتا ہے۔

انھوں نے اپنی آنکھوں سے ایک گرجتے ہوئے انقلاب کی خوں آشامیاں دیکھی تھیں۔ ایک معاشرے کو دم توڑتے ہوئے دیکھا تھا، اس کی سسکیاں اور کرب انگیز چیخیں بھی سنی تھیں ان کی نگاہوں کے سامنے ایک صدیوں پرانا محل ٹوٹ کر گر پڑا تھا انھوں نے اس گرتی ہوئی زمین بوس عمارت کو دیکھا تھا۔ اس کی بنیادوں پر خون کے چھینٹے بھی دیکھے تھے جہاں بیٹھ کر ایک نظام نے آٹھ سو سال تک ہندوستان پر راج کیا تھا کرگھوں اور چرخوں کی مدھم آوازوں کے بجائے ان کے سامنے ہی سامنے عفریت پیکر مشینوں کی گڑگڑاہٹ گونجنے لگی تھی۔ ایک سلطنت کا جھلملاتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا تھا، اس کے بجائے یہاں کے آسمان پر ایک ایسا آفتاب چمک اٹھا تھا جو اس وقت کی دنیا میں کہیں غروب نہ ہوتا تھا، لباس، تعلیم، رسم و رواج، سماج اور سوچ بچار میں جو انقلابات آئے تھے وہ سب اُن کے سامنے تھے۔ بہتوں پر ان کی پسندیدگی کی مہر بھی لگ چکی تھی لیکن وہ جس دور میں پیدا ہوئے تھے اس کی محبت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اسے یاد کرنے اور آنسو بہانے سے گریز کرنے کے لیے بھی آمادہ نہیں تھے۔ "غدر دہلی" کے افسانوں اور مغلیہ خاندان کے افراد کی مصائب سے بھرپور داستانوں میں جو تاثیر ہے جو کرب ہے، الفاظ کے خول میں گھٹی ہوئی جو چیخیں ہیں وہ اسی جذبے کی پیداوار ہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ وہ ان نئی تبدیلیوں اور انقلاب کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا بھی چاہتے ہیں۔ لیکن وضعداری سے مجبور ہیں۔ جب انھیں تبدیلیوں کی ہمہ گیری اور اُن کے دوررس اثرات و نتائج کا اندازہ ہوتا ہے تب وہ انھیں مشروط بنانے کے لئے انھیں ایک خاص دائرے میں محدود رکھنے کے لیے کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ زمانے کی سمت کا اندازہ، اس کا مشاہدہ اور مستقبل کا تصور ان کے ہاں بہت واضح اور مکمل ہے۔

"چند دن کی بات ہے، دنیا کے سرکش دولت مند تباہ و برباد ہوئے

والے ہیں ۔ ان میں وہی سلامت رہیں گے جو اپنی محنت سے روپیہ کماتے ہیں یا محنت سے بزرگوں کا روپیہ بچاتے اور جائز کاموں میں صرف کرتے ہیں ۔ باقی سب کا زوال آنے والا ہے ۔"

(آپ بیتی)

یہ ان کے بہتر ذہن اور بصیرت کا ثبوت ہے کہ اُنھوں نے آنے والے زمانے کے خدوخال کو نہ صرف یہ کہ صحیح طور پر پہچانا بلکہ اس کے اظہار سے بھی گریز نہیں کیا، وہ جانتے ہیں کہ ایک طویل اور لمبے عرصے کی طبقاتی جدوجہد اب آخری مرحلے پر پہنچ چکی ہے ۔ اس کا اختتام سرمایہ داری کی شکست اور عوامی طاقتوں کی فتح کی صورت میں ظاہر ہونے والا ہے ۔ لیکن وہ غریبوں کے دفعتاً فروغ کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے ۔ ان کی رائے ہے :

"یورپ میں سوشلزم اور بالشویک تحریک کا غلغلہ مچا ہے ۔ اس کا اثر تمام دنیا میں پھیلے گا ۔ کیوں کہ دنیا امیروں کے مظالم اور خود غرضیوں سے عاجز ہو گئی ہے ۔ اگر ہندوستان میں یہ اثر پیدا ہو تو میرے اس مشاہدے کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ادنیٰ اقوام کو ایک دم اعلیٰ درجے میں ہرگز نہ لایا جائے بلکہ رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ ان کو بڑھانا مناسب ہوگا ۔

موچیوں کو شائستہ موچی بناؤ ۔ وہ تحصیل داری کے قابل ہرگز نہیں ہیں ۔ دھوبی کو تعلیم یافتہ دھوبی رکھو یا گھاٹ کا افسر بنا دو، میونسپل کمیٹی کا چیرمین اس کو فوراً نہ کر دینا چاہیے ۔"

(آپ بیتی)

ان کی یہ تحریریں ۱۹۴۵ء یا اس کے لگ بھگ سالوں کی ہیں اس زمانے میں انقلاب کی رفتار آج کی مانند تیز و تند نہیں تھی؛ اس میں سستی اور آہستہ روی تھی ۔ اُنھوں نے اس زمانے میں اس کا اتنا ساتھ بھی دے دیا، یہ ان کے خلوص اور دیانت داری کا ثبوت ہے جب کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے زمانے کے معاصر اس زمانے میں نہ صرف زمانے کی تبدیلیوں سے بے پروا مستقبل سے بے نیاز اور ماضی پرست تھے بلکہ ایک حد تک

ڈھیٹ اور ہٹ دھرم نظر آتے تھے اس لیے اُنھوں نے انقلاب اور ترقی کے عناصر کا جتنا بھی ساتھ دے دیا اس زمانے کے مدنظر اسے غنیمت ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے مضامین میں جو ندرت تھی، جو بے ساختگی اور خوبصورتی تھی جو دلکشی اور گھلاوٹ تھی جو سادگی اور پرکاری تھی اس میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا جو رچاؤ تھا، تخاطب کی جو ہمہ گیری تھی وہی اپنی جگہ اتنی اہم اور بیش قیمت ہے کہ ان کے نام اور اُن کی خدمات کو اردو ادب میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ان کی تحریروں کا نصب العین آزادی اور انقلاب نہیں ہے سماج اور معاشرت کی نمائندگی اور اس کی تنقید بھی نہیں ہے۔ اس لحاظ سے ان کے ہاں مقصدیت نہیں ہے اور اسی لحاظ سے وہ محض انشا پرداز نظر آتے ہیں۔ ان کا مطمحِ نظر اوّل سے آخر تک تصوف ہی تصوف ہے لیکن ان کا تخاطب اتنا ہمہ گیر اور آفاقی ہے کہ وہ کسی ایک مذہب یا فرقے تک محدود ہونا نہیں جانتا۔ وہ کسی ایک فرقے یا مذہب تک محدود کیا بھی نہیں جا سکتا۔ انھوں نے جس چاؤ جس خلوص، جس دلچسپی اور عقیدت کے ساتھ رسول صلعم، امام حسین اور حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کا تذکرہ کیا ہے، اسی جوش، اسی خلوص اسی چاؤ اور عقیدت کے ساتھ کرشن جی کی بھگتی کے بھی گیت گائے ہیں۔ جس جذبے کے تحت میلاد نامہ اور محرم نامہ لکھا ہے اسی جذبے کے زیر اثر "کرشن بیتی" بھی لکھی وہ اس مشترکہ تہذیب کو، اس مشترکہ زبان کو، اس مشترکہ ورثے کو بے حد اہم اور ناقابلِ تقسیم سمجھے تھے جو ہندوستان کے شریفوں کے صدیوں کے میل جول اور نسلوں کے اختلاط اور جد و جہد کے باعث عالمِ وجود میں آیا تھا۔ انھوں نے اتنی عام فہم اور آسان زبان لکھی ہے جسے بے تکان ہندوستانی زبان کے دونوں رسم الخط میں لکھا اور پڑھا جا سکتا ہے اور یہ اُن کا ایسا کارنامہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بحیثیت انسان ان کی شخصیت بڑی قدآور اور استقلال و عزیمت سے بھرپور شخصیت ہے۔ اُنھوں نے دوستوں کو ہمیشہ نفع پہنچایا اور دشمنوں سے کبھی نفرت نہیں کی، انھوں نے عمر بھر تمرد اور غرور کو پاس نہیں آنے دیا۔ ان کی زندگی بڑی سنگلاخ اور دشوار گذار گھاٹیوں سے گذر کر کھلے میدان میں آئی تھی اس لیے وہ جانتے تھے کہ انسان

کا سر چاہے آسمان سے جا ملے لیکن اس کے پیر زمین پر رہنے چاہییں۔

ان کی پوری عمر رزم اور ہنگاموں میں گذری ہے۔ مخالفتوں کے طوفانوں اور دشمنوں اور حاسدوں کے حملوں سے ان کا ہمیشہ سابقہ رہا۔ ان کے سامنے ہی ان کے کئی شاگرد ان کے مقابلے میں اپنے جھنڈے لے کر آ گئے۔ کتنے ہی لوگوں نے خود ان کے [illegible] بڑھ کر آگے نکل جانے کی کوشش کی لیکن انھوں نے شائستگی، تہذیب زندہ رکھی، شرافت، سنجیدگی اور محبت کو کہیں ہاتھ سے نہیں دیا۔ حالی نے غالب کی وفات پر کہا تھا۔

اس کے مرنے سے مر گئی دلی

لیکن خواجہ صاحب کی وفات سے اس مردہ دلی کی بچی کھچی نشانی بھی ختم ہو گئی۔ وہ دلی کی رفتہ تہذیب کا ایسا نمونہ تھے جو اُن کے بعد اب کبھی دیکھنے میں نہ آئے گا۔ لیکن وہ اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور اُن کا نام ہمیشہ محبت اور احترام سے یاد رکھا جائے گا۔

تبرکات

مولانا عبدالماجد دریا آبادی

البیلا انشاپرداز

> خواجہ صاحب کی بزرگی کا حال تو کوئی بزرگ ہی بتا سکتا ہے۔ اپنا ایمان تو ان کی انشاء پردازی پر ہے۔
>
> صاحب قلم رہا انہی کی زبان میں "فنکار" کی حیثیت سے فرد تھے اور اس کی شہادت یہاں سے لے کر عالم آخرت تک دے سکتا ہوں کہ ان کا سا البیلا انشاء پرداز اردو میں نہ کوئی ان کے زمانے میں پیدا ہو سکا اور نہ آج تک ہوا ہے۔
>
> وہ صحیح معنی میں عوامی انشاء پرداز تھے۔ ساز سے زیادہ سوز کے مالک اور اس سے بڑھ کر تاریخ ادب پر کوئی ظلم نہیں کہ کتابوں پر کتابیں اور مقالوں پر مقالے، نثر اردو کے ماہرین پر تیار کر دیے جائیں اور ان میں اُن مرحوم کا نام تک نہ آئے۔
>
> شخصی حیثیت سے وہ ایک بڑے وفادار دوست اور بڑے مہمان نواز تھے۔
>
> عبدالماجد

"اس زمانے میں ایک ہی ہیں"۔۔ ـــــ خوب کہا جس نے یہ کہا۔ لیکن کس نے کس کو کہا؟ کہنے والا کوئی ہما شما نہیں، وقت کا حکیم تھا، عارف تھا، شاعر تھا۔ سب کچھ تھا۔ یعنی اکبر الہ آبادی" اور کہا جس کو، وہی تو ہے آج کی محفل کا نوشہ، دہلی کی خاک کا پتلا، قلم کی

شوخیوں اور رنگینیوں کا متوالا۔ ابھی جس کی قلم کاریوں کی سحر نگاریوں کی ایک ہلکی اچٹتی سی جھلک میں دکھانے بیٹھا ہوں اور آپ اِدھر آڑ میں بیٹھے ہیں دیکھئے۔

شعر دو مصرعوں کا ہوتا ہے اور ابھی آپ کے کانوں میں اکبر کا شعر کیا معنی پورا مصرع بھی نہیں گو بجا صرف آدھا مصرع عرض ہوا تھا، پورا شعر اب ملاحظہ ہو:

حسن نظامیؒ ہیں نیک بیشک مگر نہ کہیے کہ نیک ہی ہیں
لطائفِ قلب کی نظر سے بھی اس زمانے میں ایک ہی ہیں

خیر وہ حسن نظامیؒ نیک ہی ہیں یا کچھ اور بھی۔ اس سے تو کراماً کاتبین کو بحث ہوگی یا حضرتِ اکبر کو۔ ہمارا آپ کا اس سے واسطہ کیا۔ اپنے سروکار تو بس اس حسن نظامی سے ہے جو قلم کا دھنی ہے۔ اردو زبان کی دنیا میں فردِ فرید اور ادب و انشا کے عالم میں صاحب طرزِ جدید۔

کوئی سلیس، عام فہم، بے تکلف دہلی کا روزمرہ اور بول چال سننا چاہے تو حسن نظامی کی زبان سے سُنے، کوئی میٹھی، سُریلی، سجیلی، البیلی اردو کی بہار دیکھنا چاہے تو انہی دہلی والے خواجہ کے قلم کے تراشے ہوئے گل بوٹے، نقش و نگار دیکھے کہ زبان پر انہی کا سہرا ہے۔ انہیں شگفتگی اور ندرتِ بیان اُن کا خاص جوہر ہے اور اثر و درد و گداز ان کے قلم کا امتیازی جوہر۔ جب چاہیں روتے بسورتے ہوؤں کو ہنسا دیں اور جب چاہیں ہنستے کھلکھلاتے ہوؤں کو رلا دیں۔ بچوں کو طرح طرح کے کھلونے دے کر بہلاتے ہیں، جوانوں کا خون گرماتے ہیں اور بوڑھوں کو تسکینِ قلب کی نیند سلاتے ہیں۔ تصویر کشی میں یہ کمال کہ جس مضمون پر قلم اٹھائیں قال کو حال بنا دیں۔ حرف کے پیکرِ بے جان کو جاندار بنا کر دکھا دیں۔ شنید کو دید کا جامہ پہنا دیں۔ مضمون دیاسلائی پر لکھیں تو جیسے آنکھوں کے آگے اُجالا پھیلا دیں۔ عنوان آتش بازی ہاتھ آئے تو جیسے خود پھلجھڑی چھٹنے کا تماشا دکھا دیں اور صاحب بڑی بات یہ کہ لکھتے لکھاتے جو کچھ بھی ہیں، سب بس اپنی خداداد ذہانت سے اپنی جبلی جدتِ طبع کے کس بل پر۔ انھوں نے کسی کا رنگ اڑایا اور نہ کسی کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا۔ ان کے معاصر ایک سے ایک بڑے ادیب اور انشا پرداز اور اُن کے بعض پیش رو جادو نگار و سحر طراز۔ لیکن خواجہ اپنی انفرادیت میں سب سے ممتاز۔ ان کا رنگ اگلوں اور پچھلوں سب سے نرالا۔ یہ نہ کسی کے شاگرد نہ کسی

کے مقلد اور ادب و انشار کو اگر ایک قسم فقہ کی قرار دیا جائے تو یہ پکے غیر مقلد۔

یہ بندوں کا ذکر اور اُن سے خطاب جس طرح کرتے ہیں اُس کا نمونہ کلام کی بسم اللہ کے طور پر سب سے پہلے یہ ملاحظہ ہو کہ یہ اپنے مالک و مولا سے راز و نیاز کس انداز کا رکھتے ہیں۔ اپنی کتاب "آپ بیتی" کی تمہید اس مناجاتی لب و لہجہ میں اُٹھاتے ہیں۔

"یا اللہ میری مدد کر، تو مراد ہے، ہم مرید ہیں، تو حقیقت ہے، ہم مجاز ہیں، تو جڑ ہے، ہم شاخیں ہیں۔ تو نور السموات والارض ہے۔ ہم تیری شعاعیں ہیں۔ ظاہر میں میرا ہاتھ تیرے بندوں کو مرید کرتا ہے اور اُن کی بیعت لیتا ہے۔ مگر باطن میں تیرا ہی ہاتھ ہمارے ہاتھوں پر ہے اور تو ہی ہمارے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر بیعت قبول کرتا ہے۔ پس مجھ کو توفیق دے کہ اپنے ہاتھ پر مرید ہوتے والوں کو اپنے وجود سے کمتر نہ سمجھوں۔ نہ اپنی ذات کو پیر اور مراد خیال کروں۔ بلکہ تجھ کو مراد اور پیر تصور کرکے اپنے مریدوں کو تیرا مرید اور اپنا پیر بھائی جانوں۔"

ایک ٹکڑا یہ ہوا، اور ایک صدا اسی مست الست کی اس سے چند سال قبل:

——"بجلی میں چمکنے والے، چاند میں جھلکنے والے، رات کے اندھیرے، سورج کی روشنی، آسمان کی بلندی، دریا کی روانی، جنگل کی سنسانی، دلگیری و دلداری کے مالک، عرش کی اقامت میں جدا، دل کے گھرانے میں خدا،—— ہم تیرے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اگر تو عرش پر ہے تو ہم کو سربلند کر۔ فرش میں ہے تو وسعت و ثابت قدمی عطا فرما۔ دل میں ٹھکانا ہو تو اسے رہنے کے قابل بنا دے۔ رگِ جاں میں ہے تو خون میں اپنی شانِ بان کا جوش پیدا کر، اگر تو ہر جگہ ہے تو ہم کو بھی ہر جگہ پہنچا۔ تو عالم ہے تو اپنے علم کا حصہ ہمیں دے، رازق ہے تو ہمارے ہاتھوں سے رزق بانٹ، رحمٰن ہے تو رحمت نازل فرما، خیر کو وسعت دے کر شر سے بچا —— ہماری آنکھ بن، تجھ سے دیکھیں، کان تجھ سے سنیں، زبان میں تو ہی بول، ہاتھ سے تو ہی کام کر۔ تو بعید ہے تو قریب آجا، قریب ہے تو اقرب ہو جا، اقرب ہے تو نحنُ اَقرَبُ کا حجاب بھی اُٹھ دے"

صاف، بے تکلف، چھوٹے چھوٹے سادہ فقرے، نہ پیچیدہ ترکیبیں، نہ مغلق لفظیں،

نادر عبارتیں۔ اس اردو کو ہندیانا چاہیں تو مقصود بغیر محنت و مشقت حاصل، گویا خواجہ حالیؔ پانی پتی نے جو اعجاز اپنی "بیوہ کی فریاد" میں دکھایا ہے اس خواجہ دہلوی کی یہ نثر اس کی حامل اور پھر ان کی زبان کسی مضمون پر بھی بند نہیں۔ عنوان کوئی سا بھی ہو، ان کا قلم اس سے عاری نہیں۔ میدانِ بزم ہو تو:

ہے قلم اُن کا ابرِ گوہر بار

اور صفِ رزم ہو تو:

ہے زبان اُن کی تیغِ جوہر دار

ان کی تحریرات کے مجموعے میں کیا کچھ نہیں ہے۔ بقول شخصے:

کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں

اپنے معاصرین کے قلمی چہرے انھوں نے کثرت سے تیار کیے ہیں اور ہر چہرے کی تیاری میں گویا نقاش کے برش اور فوٹوگرافر کے کیمرے کو مات دے دی ہے ایک مشہور اور بڑے تکڑے معاصر مولانا ظفر علی خاں کی شخصیت کی تصویر ملاحظہ ہو:

"... درمیانہ قد، گندمی رنگ۔ چھریرا بدن، آنکھیں روشن و متحرک اور آواز بلند اور باوقار ـــــ بولنے میں روانی اور بیباکی۔ نظم و نثر لکھنے میں پنجاب کے پانچوں دریاؤں سے زیادہ رواں: قادر الکلام، مگر قادر المزاج نہیں۔ بھک سے اُڑ جانے والی بارود ہیں۔ ان کی بول چال، لہجے اور تحریر میں پنجابی اثر بالکل نہیں ہوتا مگر ان کی اردو عرب سے بن کر آئی ہے اور فارس کے راستے یہاں پہنچی ہے۔ ہجو خوب لکھتے ہیں۔ ترجمہ کرنے میں کوئی ان کی برابری نہیں کر سکتا۔ قیامت کے دن اپنی نعتوں کے باعث بخشے جائیں گے۔"

دل لگی یہ ہے کہ اس معاصرت حریفانہ چشمکیں بھی قدیم سے چلی آتی ہیں۔ چوٹیں برابر کی رہتی ہیں۔ اِن کا نثر اُن کے متعلق ہو چکی۔ اجازت ہو تو ذرا اُن کی نظم بھی اِن کی شان میں ہو جائے۔ زیادہ نہیں کل ایک شعر دفتر کے دفتر کا لب لباب:

صوفی بھی ہیں رئیس بھی ہیں اور ملنگ بھی ‏ ‏ ‏ اور جانتے ہیں خواجہ تجارت کے ڈھنگ بھی

خواجہ کو "مصورِ فطرت" کا لقب جس کسی نے دیا بالکل ٹھیک دیا۔ اشیاءِ فطرت کی تصویر کشی میں لاجواب ہیں۔ اپنی تصویر بس آپ ہیں۔ لیکن طبیعت کو مناسبت غم و الم سوز و گداز سے زیادہ ہے، ہنسی دل لگی سے ذرا کم، ڈراما نگاری پر آتے تو کامیڈی سے کہیں زیادہ ٹریجڈی میں نام پاتے۔ ایک لٹی پٹی امیر اور مٹی مٹائی رئیس خاتون کی داستان لکھتے ہیں جو آخر میں دن بھر ایک قبرستان میں پڑی رہتی اور رات کے وقت اپنی بچی کو ساتھ لے کر بھیک مانگنے نکلتی۔ اس بھکارن کی صدا ذرا دل تھام کر سنیے:

"دولت والو ٹکڑا دو، عزت والو ٹکڑا دو، اپنے بچوں کا صدقہ ٹکڑا دو۔ اپنے لالوں کا صدقہ ٹکڑا دو، تمھاری چوڑی کی خیر، تمھاری مہندی کی خیر، ایک نوالہ دو میرا خالی پیالہ —— لوگو! تمھارے محلے میں ٹھوکریں کھانے والی بھکارن آئی ہے ساتھ میں اس کی جائی ہے، ہم دونوں پر بھوک کی مار آئی ہے۔ دہائی ہے، ایک نوالہ مجھ کو دو —— سونے والو جاگو، ایک دن میں بھی سوتی تھی، پیا کا ہیرا موتی تھی، دنیا نے تاراج کیا، اس کو جس نے راج کیا۔ اب گدڑی میں اجوڑا ہے اور پاؤں کا چھالا گھوڑا ہے۔ جشن کی راتیں فانی ہیں، موج کے دن سب پانی ہیں۔ کنڈی کھولو ٹکڑا دو۔ ہاتھ بڑھاؤ ٹکڑا دو۔ روکھا ہو، باسی ہو، سب ہے نعمت، بھوک سے میری بری ہے نوبت، یہ ننھی بچی روتی ہے، یہ محل کی ملکہ گود میں تھی، اب گدا کی دختر پیدل ہے۔ یہ باپ کی پیاری، دکھ کی ماری، تمھارے دوار آئی بھکاری، ٹکڑا دو، میرا دو۔ یہ دنیا آنی جانی ہے، ذرہ ذرہ فانی ہے۔ غفلت میں مدہوش نہ ہو، عبرت سے باہوش رہو۔ صدقہ کا ایک ٹکڑا دو۔"

بھکارن کی یہ صدا بیشک فطری اضطراری نہیں اس میں آرٹ (صنعت) کی آمیزش ہے لیکن صنعت اور شے ہے اور تصنع اور فقروں میں یقیناً تراش خراش اور کاوش فکر سے [illegible] لیا گیا ہے۔ پھر بھی آمد ہی [illegible] ہے، آورد کہیں سے نہیں، تکلف کا سایہ بھی نہیں پڑنے پایا۔ [illegible] لیکن وہ قافیے بھی جیسے ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہی ہوئے ہیں۔ ٹھونس [illegible] احساس بھی نہیں ہونے [illegible] اور کہنے والوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ یہ آرٹ کی معراج

کمال ہے۔"

خواجہ صاحب نے دلی کے شہزادوں اور شہزادیوں کے حالات بڑی تفصیل سے اور بڑے درد و گداز سے لکھے ہیں اور غدر ۱۸۵۷ء کے حالات سے ان کی کتابوں کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ اُن کے قلم کی ندرت اور اُن کے دماغ کی جدت اُن میں سے ایک ایک سے ٹپکتی ہے اور پڑھنے والے کو اکثر رُلا رُلا دیتی ہے۔ "بیگمات کے آنسو" "انگریزوں کے قصے" "دلی کی آخری شمع" "دلی کا آخری سانس" "بہادر شاہ کا روزنامچہ" وغیرہ چھوٹی بڑی خدا معلوم کتنی کتابیں انھیں داستانوں سے بھر دی ہیں۔ داستانیں کیسی؟ غفلت میں ڈالنے والی نہیں عبرت کو بیدار کرنے والی، خوفِ خدا دلانے والی، دل میں سوچ پیدا کرنے والی اور ہمارے آپ کے ڈھب کی بات یہ کہ داستان گو کی بانکی تیکھی شخصیت کا نقش دل پر بٹھانے والی۔

میلاد کی محفلیں آپ نے بہت سی دیکھ ڈالی ہوں گی۔ میلاد نامے بھی خدا جانے کتنے پڑھ ڈالے ہوں گے ایک عید میلاد کی تمہید ذرا حسن نظامی کی زبان سے بھی سن لیجیے۔

"ایک سوا ایک ضرب الا اللہ کی سلامی دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں۔ آنکھیں مژگان کی سنان اور ابرو کی تیغ سنبھالے، ادب سے پتلیاں جھکائے کھڑی ہیں۔ زبان درود کا بینڈ بجائے۔ بدن کی سب رگوں کو حکم دو کہ صلواتی بینڈ میں یک جان ہو کر سر ملائیں۔ یہاں تک کہ ہر بن مو سے نغمۂ صلِ علیٰ محمدٍ نکلنے لگے۔ روزہ کی عید، حج کی عید، دونوں دست بستہ آئیں اور عید میلاد کا خیر مقدم کریں، دودھ سویوں اور قورمہ چپاتی کو اس عید سے کوئی سروکار نہیں۔ جو کی روٹی کھاؤ اور خوشی مناؤ ——"

فرمایئے ایسی ایسی تمہید کہیں اور نظر سے گذری ہے؟ شمع کو جلتے کس نے نہیں دیکھا! اب دیکھیے خواجہ صاحب اپنے قلم ندرت رقم کے زور پر اس معمولی نظارے سے حکمت کے کیسے کیسے پھول کھلاتے اور معرفت کے کیا کیا موتی برساتے ہیں۔

—— "حضرت اکبر کی میز پر مومی شمع گورے سنتری کی طرح تنی کھڑی ہے۔ اس کا قدِ زیبا سر سے پاؤں تک سڈول ہے۔ جی کو بھا گیا۔ چکنی چپڑی صورت

پر دل آگیا۔ چاہتا تھا کہ اس مسِ خاموش کو گویا کردں اور اپنی محبت کے پھندے میں پھنساؤں کہ کسی نے اس کے سر پر شعلے کا تاج رکھ دیا۔ اہا ہا، عالم ہی بدل گیا۔ کلاہِ نور میں پیاری شمع کی شکل کیسی دل فریب بن گئی۔ پروانے باغ کی ڈالیوں سے اُڑ اُڑ کر کمرے میں آنے لگے۔ میرا لطفِ دید ختم نہ ہوا تھا کہ جنابِ اکبر کا شعر کان کی راہ سے آنکھوں میں سما گیا۔

زینت، مقدمہ ہے مصیبت کا دہر میں
سب شمع کو جلاتے ہیں سانچے میں ڈھال کے

گفتگو شروع حضرتِ اکبر کے ایک فقرے سے ہوئی تھی۔ خاتمے پر جی میں آتا ہے کہ پھر اسی کو دہرا لیجیے۔ مردم شناس اور فطرت شناس شاعر کے بقول ہمارے انشا پرداز خواجہ حسن نظامی در

"اس زمانے میں ایک ہی ہیں"

مولانا صلاح الدین

حضرت خواجہ حسن نظامی
ایک صاحبِ طرز انشاپرداز

خواجہ حسن نظامی کا شمار ہمارے ان چند صاحبِ طرز ادبا میں ہوتا ہے جن کا ہر پارۂ نگارش ان کی طرزِ خاص کا غماز ہے۔ اس چھوٹے سے گروہ میں ان کے ساتھ دونوں آزاد (محمد حسین اور ابوالکلام) سجاد حیدر یلدرم اور ظفر علی خاں شامل ہیں۔ اور اگرچہ گذشتہ نصف صدی میں نثرِ اردو نے متعدد بلند پایہ اہلِ قلم پیدا کیے ہیں، لیکن یہ امتیاز انھیں عناصرِ خمسہ کے حصے میں آیا ہے کہ ان میں سے کسی کی دو سطریں پڑھ کر بھی ایک ذہین ناظر بآسانی بتا سکتا ہے کہ یہ کس کے خامۂ سحر نگار کی مرہون ہیں۔

خواجہ صاحب کے متعلق ایک صاحبِ نظر کا قول ہے کہ وہ نثرِ اردو کے نظیر اکبرآبادی ہیں۔ یہ دل چسپ مقولہ اس حد تک تو یقیناً درست ہے کہ جس طرح نظیر اکبرآبادی نے اپنی بیشتر منظومات عوام کے لیے لکھیں، اسی طرح خواجہ صاحب کے مضامین بھی ایک نہایت وسیع پیمانے پر عوام کے دل و دماغ تک پہنچے اور ان کی جدا در کشادگی کا باعث ہوئے، اور اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ نظیر کے اشعار کی طرح خواجہ صاحب کے نثرپارے بھی زبان کے اعتبار سے بدرجۂ غایت صاف، سلیس، اور سہل ہیں اور ان کی یہی خوبی ان کے قبولِ عام کی ضامن ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ نظیر اور خواجہ صاحب دونوں کے موضوعاتِ سخن اور عنواناتِ کلام کم و بیش ایک ہی نوع اور ایک ہی سطح سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، کچھ آگے بھی بڑھتی ہے ——— ابلاغ و خطاب کی کیفیت اور موضوعات کی یکسانی کے علاوہ خواجہ صاحب کی نگارش میں کچھ اور خصوصیتیں بھی پائی جاتی ہیں جو نظیرؔ کے ہاں موجود نہیں ہیں، یا جو نظیرؔ کے رنگ کے عین خلاف ہیں مثلاً خواجہ صاحب کے ہاں ابتذال بالکل مفقود ہے اور نظیرؔ کے کلام میں یہ ایک عنصرِ خاص کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح نظیرؔ جب کسی پیشِ نظر موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے تو ایک عرصے تک اس کے خارجی منظر ہی میں کھویا رہتا ہے۔ باطن کی طرف اُس کی نگاہ بہت دیر میں لوٹتی ہے۔ لیکن خواجہ صاحب کے ہاں اس کیفیت کا بالکل عکس پایا جاتا ہے۔ وہ بظاہر ایک نہایت معمولی عنوان پر قلم اٹھاتے ہیں اور ابھی ان کا ناظر یہ سوچ ہی رہا ہوتا ہے کہ آخر وہ ایسے پیش پا افتادہ عنوان پر پھیس گے کیا، کہ وہ ایک یکسر ڈرامائی جنبش کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑے اس باطنی دنیا میں اُتر جاتے ہیں، جہاں اُن کے نادرہ کار تخیل نے پہلے ہی سے ایک جہانِ خراب آباد کر رکھا ہے اور جو اپنے اچھوتے مناظر پیش کرنے کے لیے خارجی دنیا سے ایک ادنیٰ تحریک کا منتظر رہتا ہے ——— پھر خواجہ صاحب کے پیشِ نظر ہمیشہ ایک خاص مقصد ہوتا ہے، خواہ وہ اصلاحی ہو یا تعلیمی، سیاسی ہو یا دینی۔ اس کے خلاف نظیرؔ ایک آزاد فن کار ہے جو بسا اوقات صرف اپنا ہی جی خوش کرنے کو دو بول کہہ لیتا ہے، اور کبھی جی میں آتا ہے تو اپنے سننے والوں کا دل خوش کر دیتا ہے اور کبھی کبھی شاید دنیا کی بے ثباتی اور دنیا والوں کی گمراہی پر بھی کچھ ہنس دیتا ہے، کچھ رو لیتا ہے۔ خواجہ صاحب کا مسلک یہ نہیں ہے۔ وہ جہاں ایک ادیب سحر طراز ہیں، وہاں ایک نہایت باعمل دنیا دار بھی ہیں۔ اس لیے اُن کے صوفیانہ اور قلندرانہ اقوال کے ساتھ ہمیشہ ایک گہرا افادی احساس وابستہ ہوتا ہے اور نگارش کی یہ کیفیت اُنہی سے خاص ہے۔

پھر نظیرؔ اور خواجہ صاحب کے زمانے میں کم و بیش پون صدی کا ایک ایسا عہد حائل ہے جس میں اُردو زبان و ادب کی بیشتر صورتیں یکسر بدل گئیں۔ نظیرؔ کے زمانے میں فارسی آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی اور صرف خواص کے حلقے میں محدود ہو کر رہ گئی تھی اور عوام خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اپنے جذبات کے اظہار اور اس اظہار کی بازگشت سننے

کے لیے بہ کمالِ ذوق و شوق اردو کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر کے کلام میں ہندو معاشرت اور ہندو روایات کا بہت بڑا عنصر شامل ہے۔ نظیر کے عہد کے ہندو جب نظیر کے موہن بولوں میں کرشن مراری کی پریم کہانی اور رام نام کی مہما سنتے اور ہولی اور دیوالی کی ہنستی بولتی تصویریں دیکھتے تو وہ دیوانہ وار اس کی طرف کھنچے چلے آتے اور اس کے بول آپ ہی آپ ان کی زبانوں پر جاری ہو جاتے ــــــ خواجہ حسن نظامی نے جب قلم ہاتھ میں لیا تو یہ سارے کا سارا نقشہ بدل چکا تھا اور بعض انشاپردازوں کا رجحان واضح طور پر ایسی طرزِ تحریر کی طرف ہو گیا تھا جو ہندی الفاظ سے قطعاً معرّیٰ اور عربی فارسی الفاظ سے معمور تھی۔ خواجہ صاحب نے عربی مدرسں میں تعلیم پائی تھی۔ انگریزی سے وہ بالکل [illegible] تھے اور ہندی ابھی انھوں نے نہیں سیکھی تھی۔ لیکن وہ مبدأ فیاض سے [illegible] اور طبعِ نکتہ رس لے کر آئے تھے اور جدید اعلیٰ تعلیم سے محروم رہنے اور آغازِ زندگی سے مکروہاتِ دنیوی میں گرفتار ہو جانے کے باوجود انھوں نے محض اپنی فطری ذہانت سے یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ ہندوستان میں اردو ہندو مسلم کلچر کے اشتراک کی واحد یادگار ہے اور اگر اس ملک میں ہندو مسلمانوں کو دوش بدوش رہنا اور ترقی کرنا ہے تو اس مشترک یادگار کو جو خود فطرت نے انھیں عطا کی تھی، مٹنے نہیں دینا چاہیے بلکہ اس کی ترقی اور فروغ کے لیے دونوں قوموں کو کوشش کرنی چاہیے۔ اس خیال کے مستحکم ہوتے ہی انھوں نے اسے عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا اور ان کا اسٹائل اُن کی اسی شعوری کوشش کا ایک عملی اور دل کش نتیجہ ہے۔ وہ اس نکتے تک پہنچ چکے تھے کہ اردو ہندی کا سوال سماج کے اُن طبقوں سے تعلق رکھتا ہے جو دن رات سیاست کے پتے الٹتے پلٹتے رہتے ہیں، یا اس دیس میں پراچین بھارت کے تمدن کو واپس لانا چاہتے ہیں۔ ان دونوں باتوں سے عوام کو کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ پس انھوں نے موقع کی خوبی اور ہوا کا رخ پہچان کر یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ لوگ اُدھر اپنی مہمات چلاتے رہیں، اِدھر ہم عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور انھیں ایک دوسرے کی سچی روایات اور اصل مسائل سے آشنا کرنے کے لیے اچھا کام کیوں نہ جاری کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک نہایت دل کش اور آسان طرزِ نگارش ایجاد کی اور

اس میں ایسے عام فہم مضامین لکھنے شروع کردیے جو بیک وقت ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے لیے ایک نرالا جذب اور ایک اچھوتی کیفیت رکھتے تھے بلکہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھے اور انھوں نے نہ صرف ہندو تہذیب اور ہندو تاریخ کو اپنے احاطۂ نگارش میں لے لیا بلکہ مسلم تہذیب اور اسلامی تصورات کو ہندی زبان و تہذیب کا جامہ پہنا کر عوام کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔

یہ سب کوششیں نہ صرف شعوری تھیں، بلکہ اُن کا دائرۂ عمل بے حد وسیع تھا اور پریس اور ڈاک کی ممکنات نے تبلیغ و اشاعت کا میدان نہایت وسیع کر دیا تھا۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے ان سہولتوں سے بحدِ امکان فائدہ اُٹھایا اور اپنے پیغامِ محبت کو اپنی بے مثال زبان کی وساطت سے ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ اردو کی اس خدمت میں کوئی شخص ان کا حریف و مثیل نہیں اور جتنی مختلف النوع کتابیں انھوں نے لکھیں اور جس کثرت اور تندہی سے اُنھوں نے ان کی اشاعت کی، میری ناچیز رائے میں اس برِ عظیم کا کوئی مصنف یا کوئی ادارہ گذشتہ نصف صدی میں اس کی نظیر تو کیا، اس کی ادنیٰ مثال بھی پیش نہیں کر سکتا۔

اُردو خواجہ صاحب کے گھر کی لونڈی تھی، لیکن تصوّف کی دولت اُنھیں ورثے میں ملی تھی اور ان کی ہمہ گیر طبیعت میں کچھ اس طرح جذب ہوگئی تھی کہ وہ عمر بھر اس کے بل پر نئی سے نئی فتوحات حاصل کرتے اور نئے سے نئے میدان سر کرتے چلے گئے۔ ان کی تحریروں میں جو ایک باطنی جھلک پائی جاتی ہے اور جو فی الحقیقت ان تحریروں کی جان ہے وہ اُن کی یہی تصوف دوستی ہے۔ از بس کہ وہ ہر چیز میں ذاتِ واحد کا جلوہ دیکھتے ہیں، اس لیے اُن کا اندازِ نظر بجائے خود نہایت وسیع ہو گیا ہے اور اُس کا اثر ان کی نگارشات کے باطنی پہلو سے بدرجۂ غایت نمایاں ہے اور خواجہ صاحب چونکہ عوام کے لیے لکھتے تھے، اگرچہ خواص بھی اُن سے اسی طرح فیضیاب ہوتے تھے جیسے عوام، اس لیے استطاعت کے باوجود انھوں نے کسی نوع کے دقیق مسائل کو، خواہ وہ علمی ہوں یا سیاسی، تاریخی ہوں یا اقتصادی، سماجی ہوں یا دینی، کبھی اپنا موضوع نہیں بنایا تھا۔ وہ علوم کی فلسفیانہ سطح کو نہیں چھوتے تھے، انھیں

صرف ان کے افادی پہلو سے سروکار تھا۔ ان کے بے شمار مضامین میں بے حساب مسائل ہیں،
لیکن وہ ان کے تجزیے میں کبھی فلسفیانہ رنگ اختیار نہیں کرتے، بلکہ کچھ اپنے متصوفانہ انداز
خیال اور کچھ اپنے نرالے طرزِ استدلال کی مدد سے انھیں ایک ایسے اچھوتے طریقے میں حل
کر دیتے ہیں جو ان کے ناظر کے دل و دماغ میں بیک وقت ایک تسکینِ یافت اور ایک
احساسِ مسرت پیدا کر دیتا ہے اور یہی اُن کے مقصد کی تکمیل اور اُن کی سب سے بڑی جیت ہے۔
اُن گوناگوں مسائل اور موضوعات سے قطعِ نظر جو اپنی رنگارنگی میں اُن کی نگاہِ جویاں
کے سامنے ہر صبح و شام اُبھرتے رہتے تھے، ایک خاص موضوع ایسا بھی تھا جس پر وہ عمر
بھر لکھتے رہے اور نہ کبھی خود اُکتائے نہ اپنے ناظرین کو اکتانے دیا۔ یہ موضوع دلی اور اس کی
لٹی ہوئی بہار تھا۔ دلی کی بربادی اور اس کے شاہی خاندان کی ابتری کا زخم ایک ایسا زخم تھا
جو ان کے سینے میں ہمیشہ ہرا رہا اور اہلِ ہند کو برسوں تک اُن کی گم شدہ عظمت کی یاد دلاتا
رہا۔ اب خواجہ صاحب کے بعد ہماری اِن مٹی ہوئی نشانیوں کا کوئی نام لیوا بھی باقی نہ رہا۔
خواجہ صاحب کے قلم نے دہلی اور اس کی تہذیب کے ماتم میں اعجاز دکھایا ہے اور جو باتیں
فرنگی حاکم کی تعزیر کے خوف سے صاف صاف نہیں کہی جا سکتی تھیں، انھیں حدیثِ دیگراں
کے لباس میں ایسی خوبی اور چابک دستی سے پیش کیا ہے کہ فن اور احتساب دونوں انگشت
بدنداں رہ گئے ہیں۔

زبان کی سادگی اور سلاست کی مثالیں ہمیں بعض اور مصنّفین کے ہاں بھی ملتی ہیں،
مثلاً علامہ راشد الخیری بڑی نکھری اور منجھی ہوئی زبان لکھتے تھے مگر ان کے موضوعِ خاص
کے اقتضا سے اُن کے لہجے میں کچھ نسوانیت آ گئی تھی۔ مولوی نذیر احمد جہاں خانہ داری کے
نقشے جماتے ہیں وہاں زبان و بیان کے بعض نہایت عمدہ نمونے پیش
کرتے ہیں، مگر ان کی عربی دانی اور محاورہ بندی جا بجا اُنھیں کہیں سے کہیں لے
جاتی ہے۔ خواجہ صاحب میں یہ بات نہیں ہے، ان کا اندازِ نگارش یکساں اور ہموار ہے اور
اگرچہ موضوع کے اعتبار سے اسلوب میں ایک فطری اتار چڑھاؤ اور بلند و پست ضرور

پیدا ہو جاتا ہے اور محسوس بھی ہوتا ہے، لیکن بنیادی طور پر اس میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا اور وہ مسرت و غم، شور و سکون، مد و جزر اور شوخ و بے رنگ میں سے پوری صمانیت کے ساتھ گزرتا ہوا اپنی منزل تک جا پہنچتا ہے ـــــ یہی اس کی فوز اور یہی اس کا منتہا ہے اور اسی میں اس کی دل کشی اور دل کشائی کے اسرار پوشیدہ ہیں۔ خواجہ صاحب کے اکثر مضامین میں طنز و ظرافت کی جو زیرِ سطح لہریں پائی جاتی ہیں، بنیادی طور پر وہ ان کی نکتہ آفریں ذہانت اور بلوغ یافتہ حسِ مزاح کے امتزاج کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ان کی تخلیق اور روانی میں لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کی صحبت اور اثر بھی کارفرما ہے۔ خواجہ صاحب اگر شعوری طور پر اپنے عہد کے کسی اہلِ قلم اور سخنور سے متاثر ہوئے ہیں تو وہ جناب اکبر الٰہ آبادی ہیں۔ اکبر سے ملنے اور اُن کی صحبت سے فیض پانے کے لیے وہ بار بار الٰہ آباد جاتے تھے اور مسلسل خط و کتابت جاری رکھنے میں بھی سعیِ بلیغ فرماتے تھے۔ انھوں نے اپنے دل پر اکبر کی شخصیت اور اُن کے کلام کے تاثر کا بارہا اعتراف کیا اور اپنے اکثر نظریات کو اُن کی توجہ اور صحبت کا نتیجہ قرار دیا۔ اکبر کے اسٹائل کی سادگی اور نوکیلے پن کا سراغ اُن کی اپنی نظموں کے بعد اگر کسی اور جگہ تلاش کیا جائے تو وہ خواجہ صاحب کے نثر پاروں ہی میں ملے گا۔

مضامین کے عنوان تلاش کرنے میں خواجہ صاحب بڑا اہتمام کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مضمون کے لیے عنوان کی حیثیت وہ اہمیت وہی ہوتی ہے جو کسی شخص کے لیے اُس کے چہرے کی۔ پس اگر عنوان پھیکا اور بے کیف ہے تو مضمون کی طرف کوئی توجہ نہیں کرے گا۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ عنوان کو جاذب بنا کر مضمون پر توجہ نہ کی جائے۔ وہ دونوں کے درمیان ایک نہایت بامعنی اور بااثر توازن قائم رکھتے تھے۔

خواجہ صاحب چوں کہ زندگی کے مدرسے میں تعلیم پا کر ذہنی بلوغ کو پہنچے تھے اس لیے وہ انسانی فطرت کے ایک نہایت نکتہ رس شاہد و ناظر تھے اور اُن کا نفسیاتی مطالعہ اپنی سطح کے لحاظ سے ان کے ہم عصروں میں نہایت بلند تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی کے بیشتر میدانوں میں اپنے حریفوں سے ہمیشہ بازی لے گئے۔ نفسیاتی نکتہ وری کے بے شمار مظاہر ان کے مضامین میں جا بجا نظر آتے ہیں اور خود ناظر کے ذوقِ جستجو کو تحریک دیتے ہیں۔ وہ

ہماری دنیائے ادب کے ایک بہت بڑے نباض تھے اور پورے تیقن سے اس بات کا اندازہ کرسکتے تھے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی کس مقام پر اپنے عروج کو پہنچتی ہے اور کن مقامات سے بے پروائی کے ساتھ گزر جاتی ہے۔ اپنے اس علم ویقین کو انھوں نے بڑی دانائی اور چابک دستی سے اپنی تصانیف کے حلقۂ اشاعت میں استعمال کیا اور بدرجۂ غایت کامیاب رہے۔ ان کی بے شمار اور گوناگوں تصانیف اور ان کی کامیابی اپنے مصنف کی اس بے مثال اہلیت کی شاہد اور غماز ہیں۔

اور اب چند مثالیں :۔

خواجہ صاحب کی تصانیف میں جو کتابیں اپنی ادبی اہمیت کے لحاظ سے صفِ اوّل میں جگہ پانے کی حقدار ہیں اُن میں اُن کے مجموعۂ مضامین "سی پارۂ دل" کو ایک مقامِ امتیاز حاصل ہے۔ یہ اُس زمانے کی یادگار ہے۔ جب خواجہ صاحب اور اُن کے فن، دونوں کا عہدِ شباب تھا اور ان کی تحریروں کی شوخی بڑی تیزی سے دلوں کو تسخیر کیے جا رہی تھی۔

یہ پارہ اسی زمانے کی ایک تحریر سے لیا گیا ہے۔

عنوان ہے، لالٹین۔

"لالٹین ہاتھ میں رہنے والی روشنی کا نام ہے۔ شیشے کے اس قفس کو کہتے ہیں جس کے اندر شعاعِ آتشیں قید ہے۔ ایک زمانہ تھا آندھیاں، پروانے اور چلنے پھرنے والوں کے دامن چراغوں کے دشمن تھے۔ بھرے پُرے چراغ ہوا کے جھونکے سے گل ہو جاتے تھے۔ پروانے اپنی عاشقانہ پر اندازی سے اس غریب روشنی کی ہستی کو بے جان کر دیتے تھے۔ بے احتیاط دوپٹوں کے آنچل کبھی تو ایسا ہوتا کہ نورِ چراغ اُن کے صدمے سے بجھ جاتا اور کبھی دوپٹہ خود چراغ بن جاتا تھا۔ اور بے احتیاط اوڑھنے والے کو سزائے سوختت مل جاتی تھی۔"

آج وہ وقت ہے کہ روشنی کو سب سے زیادہ ترقی اور امن وامان نصیب ہے۔ کیا مجال جو آندھی آنکھ ملائے۔ پروانہ قریب آئے اور آنچل کا دامن حملہ آور ہو۔ روشنی اطمینان و بےفکری سے چمنی کے گنبد میں رات بھر پاؤں پھیلا کر سنسناتی ہے۔

"اس نئی روشنی کے زمانے میں کائنات کی ہر چیز کا ظاہر روشن ہے، مگر باطن تاریک بجلی کی روشنی کانچ کے ہنڈوں میں ظاہر ہو کر چمکتی ہے اور تار کے باطن میں تاریک رہتی ہے۔ گیس کی روشنی کا بھی یہی عالم ہے مگر ہمیں اس سے کیا بحث سیاہ باطن ہو یا سفید باطن ہمیں تو یہ ہماری لالٹین پیاری ہے۔ چلتا پھرتا نور ہے اور اس زمانے میں برکت وہیں ہے کہ جہاں حرکت ہو۔ ایک رات میں نے لالٹین سے پوچھا، "کیوں بی! تم کو رات بھر جلنے سے کچھ تکلیف تو نہیں ہوتی؟" بولی۔ "آپ کا خطاب کس سے ہے؟ بتی سے، تیل سے، ٹین کی ڈبیا سے، کانچ کی چمنی سے۔ یا پیتل کے اس تار سے جس کو ہاتھ میں لے کر لالٹین کو لٹکائے پھرتے ہیں؟

"لالٹین کے اس سوال سے دل پر ایک چوٹ لگی۔ یہ میری ایک بھول تھی۔ اگر میں پہلے اپنے وجود کی لالٹین پر غور کر لیتا تو ٹین اور کانچ کے پنجرے سے یہ سوال نہ کرتا۔ میں حیران ہو گیا کہ اگر لالٹین کے کسی ایک جزو کو لالٹین کہوں تو یہ درست نہ ہوگا اور اگر تمام اجزاء کو ملا کر لالٹین کہوں تب بھی موزوں نہ ٹھہرے گا۔ کیوں کہ لالٹین کا دم روشنی سے ہے، روشنی نہ ہو تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ مگر دن کے وقت جب لالٹین میں روشنی نہیں ہوتی اس وقت بھی اس کا نام لالٹین ہی رہتا ہے تو پھر کس کو لالٹین کہوں۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو مجبوراً لالٹین ہی سے پوچھا۔ میں خاکی انسان نہیں جانتا کہ تیرے کس جزو کو مخاطب کروں اور کس کو لالٹین سمجھوں۔ یہ سن کر لالٹین کی روشنی لرزی، ہلی، کپکپائی گویا وہ میری ناشناسی و نادانی پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی اور کہا اے نورِ خدا کے چراغ آدم زادِ سن، لالٹین اس روشنی کا نام ہے جو بتی کے سر پر رات بھر آرا چلایا کرتی ہے۔ لالٹین اس شعلے کو کہتے ہیں جس کی خوراک تیل ہے اور جو تاریکی کے دشمن سے تمام شب لڑتی بھڑتی رہتی ہے۔ دن کے وقت اگرچہ یہ روشنی موجود نہیں ہوتی لیکن کانچ اور ٹین کا پنجر مدت بھر اس کی ہم نشینی کے سبب لالٹین کہلانے لگتا ہے۔ تیرے اندر بھی ایک روشنی ہے اگر تو اس کی قدر جانے اور پہچانے تو سب لوگ تجھ کو روشنی کہنے لگیں۔ خاک کا پتلا کوئی نہ کہے۔ دیکھ خدا نے ولیوں کو جو رات بھر اپنے پروردگار کی نزدیکی و قربت کی خواہش میں کھڑے گزار دیتے ہیں تو دن کے وقت

ان کو نورِ خدا سے علیحدہ نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد ان کی قبروں کی بھی وہی شان رہتی ہے۔ پہلے چمنی کو صاف کر یعنی اپنے لباسِ ظاہری کو گندگی و نجاست سے آلودہ نہ ہونے دے۔ اس کے بعد ڈبیا میں صاف تیل بھر۔ یعنی حلال روزی کھا اور پھر دوسرے کے گھر کے اُجالے کے لیے اپنی ہستی کو جلا جلا کر مٹا دے۔ اس وقت تو بھی قندیلِ حقیقت اور فانوسِ ربّانی بن جائے گا۔"

"غدر دہلی کے افسانے"

خواجہ صاحب کی دوسری اہم کتاب ہے۔

خواجہ صاحب کو غم کے مضامین بیان کرنے کا جو سلیقہ ہے، اس میں علامہ راشد الخیری کے سوا اور کوئی اُن کا حریف نہیں۔ پھر ان مضامین میں سے دہلی کی بپتا ایک ایسا موضوع ہے جس سے اُنھیں ایک خاص دلی لگاؤ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں بیگمات کی آنکھوں سے جو آنسو ٹپکے ہیں، وہ سب کے سب انھوں نے اپنے دامنِ جاں میں رکھ لیے ہیں اور پھر یہی آنسو رِس رِس کر اُن کی تصانیف کے صفحات کو رشکِ گلزار بناتے چلے گئے ہیں۔ ذرا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"جب انگریزی توپوں نے، کرچوں اور سنگینوں نے، حکیمانہ توڑ جوڑ نے ہمارے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ تاج سر سے اُتار لیا۔ تخت پر قبضہ کر لیا۔ شہر میں آتش ناک گولیوں کا مینھ برس چکا۔ سات پردوں میں رہنے والیاں بے چادر ہو کر بازار میں اپنے وارثوں کی تڑپتی لاشوں کو دیکھنے نکل آئیں۔ چھوٹے بن باپ کے بچے ابا ابا پکارتے ہوئے بے یار و مددگار پھرنے لگے۔ حضور ظلِ سبحانی جن پر ہم سب کا سہارا تھا، قلعہ چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ اُس وقت میں نے بھی اپنی بوڑھی والدہ، کم سن بہن اور حاملہ بیوی کو ساتھ لے کر اور اُجڑے قافلے کا سالار بن کر گھر سے کوچ کیا۔

ہم لوگ دو رتھوں میں سوار تھے۔ سیدھے غازی آباد کا رُخ کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولاں گاہ بنا ہوا ہے اس لیے شاہدرہ سے واپس ہو کر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر رات کو آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔

چھتر پور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب سامان لوٹ لیا۔ مگر اتنی مہربانی کی کہ ہم کو زندہ چھوڑ دیا۔ وہ لق و دق جنگل۔ تین عورتوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کیسی، ایک بڑھاپے سے لاچار، دو قدم چلنا دشوار۔ دوسری حاملہ اور بیمار۔ تیسری دس برس کی معصوم لڑکی، زار و نزار عورتیں روتی تھیں اور بیان کر کرکے روتی تھیں۔ میرا کلیجہ ان کے بیان سے پھٹا جاتا تھا۔ والدہ کہتی تھیں الٰہی ہم کہاں جائیں۔ کس کا سہارا ڈھونڈیں۔ ہمارا تاج و تخت لٹ گیا تو ٹوٹا پھوٹا بوریا اور امن کی جگہ تو دے۔ اس بیمار حاملہ پیٹ والی کو کہاں لے کر بیٹھوں۔ اس معصوم بچی کو کس کے حوالے کروں —— جنگل کے درخت بھی ہمارے دشمن ہیں۔ کہیں سایہ نظر نہیں آتا۔ بہن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی اور ہم سب کا منھ تکتی تھی مجھ کو اس کی معصومانہ بےکسی پر بڑا ترس آتا تھا۔ آخر مجبوراً میں نے عورتوں کو دلاسا دیا اور آگے چلنے کی ہمت بندھائی۔ گاؤں سامنے نظر آتا تھا۔ غریب عورتوں نے چلنا شروع کیا۔ والدہ صاحبہ تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھیں اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اور جب وہ یہ کہتیں۔

'تقدیر ان کو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو تاجوروں کے ٹھوکریں مارتے تھے۔ قسمت نے ان کو بےبس کر دیا۔ جو بےکسوں کے کام آتے تھے۔ ہم چنگیز کی نسل ہیں جس کی تلوار سے زمین کانپتی تھی۔ ہم تیمور کی اولاد ہیں جو ملکوں کا اور شہریاروں کا شاہ تھا۔ ہم شاہ جہاں کے گھر والے ہیں جس نے ایک قبر پر جواہر نگار بہار دکھا دی اور دنیا میں بےنظیر مسجد دہلی کے اندر بنا دی۔ ہم ہندوستان کے شہنشاہ کے کنبے میں ہیں۔ ہم عزت والے تھے زمین میں ہمیں کیوں ٹھکانا نہیں ملتا وہ کیوں سرکشی کرتی ہے، آج ہم پر مصیبت ہے آج ہم پر آسمان روتا ہے،'

تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ القصہ بہ ہزار دقت و دشواری گرتے پڑتے گاؤں میں پہنچے۔ یہ گاؤں مسلمان میواتیوں کا تھا۔ انھوں نے ہماری خاطر کی اور اپنی چوپاڑ میں ہم کو ٹھہرایا۔

"کچھ روز تو ان مسلمان گنواروں نے ہمارے کھانے پینے کی خبر رکھی اور چوپاڑ میں ہم کو ٹھہرائے رکھا۔ لیکن کب تک یہ بار اُٹھا سکتے تھے۔ اُکتا گئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ میاں جی چوپاڑ میں ایک برات آنے والی ہے تو دوسرے چھپر میں چلا جا اور رات دن نٹھاؤ (بے کار) بیٹھے کیا کرے ہے کچھ کام کیوں نہیں کرتا۔ میں نے کہا بھائی جہاں تم کہو گے جا پڑیں گے۔ ہمیں چوپاڑ میں رہنے کی ہوس نہیں ہے۔ جب فلک نے عالی شان محل چھین لیے تو اس کچے مکان پر ہم کیا ضد کریں گے اور رہی کام کرنے کی بات سو میرا جی تو خود گھبراتا ہے۔ خالی بیٹھے بیٹھے طبیعت اُکتائی جاتی ہے۔ مجھ کو کوئی کام بتاؤ، ہو سکے گا تو سر آنکھوں سے کروں گا۔ ان کا چودھری بولا "ہم نے کئے بیرا (ہمیں کیا خبر) کہ توکے کام (کیا کام) کر سکے ہے" میں نے جواب دیا "میں سپاہی زادہ ہوں۔ تیغ تفنگ چلانا میرا ہنر ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں جانتا۔" گنوار ہنس کر کہنے لگے "نہ بابا یہاں تو ہل چلانا ہوگا۔ گھاس کھودنی پڑے گی۔ ہم نے تلوار کے ہنر کیا کرنے ہیں۔" گنواروں کے اس جواب سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے، اور جواب دیا کہ بھائیو مجھ کو تو ہل چلانا اور گھاس کھودنی نہیں آتی۔ مجھ کو روتا دیکھ کر گنواروں کو رحم آگیا اور بولے "اچھا تو ہمارے کھیت کی رکھوالی کیا کر اور تیری عورتیں ہمارے گاؤں کے کپڑے سی دیا کریں۔ فصل پر تجھ کو اناج دے دیا کریں گے جو تجھ کو برس دن کافی ہوگا۔"
چنانچہ یہی ہوا کہ میں سارا دن کھیت پر جانور اُڑایا کرتا تھا اور عورتیں کپڑے سیتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بھادوں کا مہینہ آیا اور گاؤں میں سب کو بخار آنے لگا۔ میری بیوی اور بہن کو بھی بخار نے آدبایا۔ وہ گاؤں، وہاں دوا اور حکیم کا کیا ذکر۔ خود لوٹ پوٹ کر اچھے ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم کو دواؤں کی عادت تھی سخت تکلیف اُٹھانی پڑی۔ اسی حالت میں ایک روز اس زور کی بارش ہوئی کہ جنگل کا نالہ چڑھ آیا اور گاؤں میں کمر کمر پانی ہوگیا۔ گاؤں والے تو اس کے عادی تھے لیکن ہماری حالت اس طوفان کے سبب مرنے سے بدتر ہوگئی چونکہ پانی ایک ہی رات کے وقت گھس آیا تھا اس لیے ہماری عورتوں کی چارپائیاں بالکل غرقِ آب ہوگئیں عورتیں چیخیں مارنے لگیں۔ آخر بڑی مشکل سے چھپر کی بلیوں میں دو چارپائیاں اڑا کر عورتوں کو اُن پر بٹھایا۔ پانی گھنٹہ بھر میں اُتر گیا۔ غضب یہ ہوا کہ کھانے کا اناج اور اوڑھنے بچھانے کے کپڑے تر ہوگیا پچھلی رات میری بیوی کے درد زہ شروع

ہوا اور سخت سردی جاڑے سے بخار بھی آیا۔ اس وقت کی پریشانی بس بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اندھیرا گھپ، مینھ کی جھڑی، کپڑے سب گیلے، آگ کا سامان ناممکن۔ حیران تھے الٰہی کیا انتظام کیا جائے۔ درد بڑھنا شروع ہوا اور مریضہ کی حالت نہایت ابتر ہوگئی۔ یہاں تک کہ تڑپنے لگی اور تڑپتے تڑپتے جان دے دی۔ بچہ پیٹ ہی میں رہا۔

"چوں کہ وہ ساری عمر ناز و نعمت میں پلی تھیں۔ غدر کی مصیبتیں ہی ان کی ہلاکت کے لیے کافی تھیں۔ خیر اس وقت تو جان بچ گئی۔ مگر یہ بعد کا جھٹکا ایسا بڑا لگا کہ جان لے کر گیا۔

صبح ہوگئی۔ گاؤں والوں کو خبر ہوئی تو انھوں نے کفن وغیرہ منگوا دیا اور دوپہر تک یہ محتاج شہزادی گور غریباں میں ہمیشہ کے لیے جا سوئی۔"

خواجہ صاحب کا رنگ ظرافت بھی ان کے دوسرے رنگوں سے کسی طور پھیکا نہیں ہے۔ انھیں آسان زبان لکھنے پر جو قدرت ہے اس نے ان کے صوفیانہ طرزِ خیال سے مل کر ان کی ظرافت میں بھی ایک انوکھی اور دل پذیر کیفیت پیدا کر دی ہے۔ وہ انفرادی مواقع دونوں سے اپنا مواد حاصل کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اس امتزاج سے نکھری ہوئی ظرافت کی ایک دل آویز قسم کو معرضِ وجود میں لاتے ہیں۔ ان کے ظریفانہ مضامین کا ایک مجموعہ "چٹکیاں اور گدگدیاں" کے نام سے کوئی چالیس برس ہوئے شائع ہوا تھا۔ شاید اس کے بعد بھی کوئی ایڈیشن نکلا ہو۔ اس میں خواجہ صاحب کی مخصوص ظرافت کے چند نہایت اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

عنوان ہے: مس چڑیا کی کہانی۔

ایک چڑے چڑیا نے نئی روشنی کی ایک اونچی کوٹھی میں اپنا گھونسلا بنایا تھا۔ اس کوٹھی میں ایک مسلمان رہتے تھے جو ولایت سے بیرسٹری پاس کرکے اور ایک میم کو ساتھ لے کے آئے تھے۔ ان کی بیرسٹری کچھ چلتی نہ تھی۔ مگر گھر کے امیر زمیندار تھے۔ گزارہ خوبی سے ہوا جاتا تھا۔ ولایت سے آنے کے بعد خدا نے اُن کو ایک لڑکی بھی عنایت کی تھی

جو ماشاءاللہ چلتی پھرتی تھی اور باپ کی طرف سے مسلمان اور ماں کی طرف سے مس بابا تھی۔

چڑے چڑیا نے کھپریل کے اندر ایک سوراخ میں گھر بنایا تنکوں اور سوت کا فرش بچھایا۔ یہ سوت پڑوس کی ایک بڑھیا کے گھر سے چڑیا لائی تھی وہ بچاری چرخہ کاتا کرتی تھی۔ اُلجھا ہوا سوت پھینک دیتی تو چڑیا اُٹھا لاتی اور اپنے گھر میں اُس کو بچھا دیتی۔

خدا کی قدرت ایک دن ایک انڈا پھسل کر گر پڑا اور ٹوٹ گیا۔ ایک ہی باقی رہ۔ چڑے چڑیا کو اس انڈے کا بڑا صدمہ ہوا۔ جس دن انڈا گرا ہے تو چڑیا گھونسلے میں تھی۔ چڑا باہر دانہ چگنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہ گھر میں آیا تو چڑیا کو چپ چپ اور مغموم دیکھ کر سمجھ میرے دیر میں آنے کے سبب خفا ہو گئی ہے۔

"لگا پھدک پھدک کر چوں چوں۔ چیں۔ چڑ چوں۔ چڑ چوں۔ چیں۔ چڑ چوں چوں۔ چڑ چوں۔ چڑ چوں چڑ چوں چوں کرنے۔ کبھی چونچ مار کر گدگدی کرتا۔ کبھی خود اپنے پروں کو پھلاتا۔ مٹکتا۔ ناچتا اور چڑیا کی چونچ پر اپنی چونچ محبت سے رکھتا۔ مگر چڑیا اُسی طرح پھولی پھولی خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے مردذات کی خوشامد کا کچھ بھی جواب نہ دیا۔ چڑا سمجھ بہت ہی خفگی ہے۔ مزاج حد سے زیادہ بگڑا گیا ہے۔ خوشامد سے کام نہ چلے گا۔ مجھ مرد کی کتنی بڑی توہین ہے کہ اتنی دیر خوشامد درآمد کی، بیگم صاحبہ نے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ یہ خیال کر کے چڑا بھی منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ اور چڑیا سے بے رُخ ہو کر نیچے بیرسٹر صاحب کو جھانکنے لگا۔ جو اپنی لیڈی کے سامنے آرام کرسی پر لیٹے تھے اور ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ چڑے نے خیال کیا .... یہ آدمی کیسے خوش نصیب ہیں۔ دونوں کا جوڑا خوش و بشاش زندگی کاٹ رہا ہے۔ ایک میں بد نصیب ہوں۔ سویرے کا گیا گیا دانہ چگ کر اب گھر میں گھسا ہوں مگر چڑیا صاحبہ مزاج ٹھکانے نہیں ہے۔ کاش میں چڑا نہ ہوتا کم سے کم آدمی بنایا جاتا۔

"چڑا اسی ادھیڑبن میں تھا کہ چڑیا نے غمناک آواز نکالی۔ چوں، چڑے نے جلدی سے مُڑ کر چڑیا کو دیکھا اور کہا چوں چوں چڑ چوں چوں۔ کیا ہے۔ آج تم ایسی چپ کیوں ہو۔ چڑیا بولی، انڈا گر کے ٹوٹ گیا۔

انڈے کی خبر سے پہلے تو چڑے کو ذرا سا رنج ہوا مگر اس نے صدمے کو دبا کر کہا۔ تم کہاں چلی گئی تھیں۔ انڈا کیوں کر گر پڑا۔ چڑیا نے کہا میں اُڑ کر ذرا چمن کی ہوا کھانے چلی تھی۔ جھپٹنے کے صدمے سے انڈا پھسل گیا۔ یہ بیان سن کر چڑا آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کے مردانہ جوش میں طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کڑک دار گرجتی ہوئی چوں چوں میں کہا۔ پھوہڑ۔ بدسلیقہ بے تمیز تو کیوں اُڑی تھی۔ تجھ کو چمن کی ہوا کے بغیر کیا ہوا جاتا تھا۔ کیا تو بھی اس گوری عورت کی خصلت سیکھتی ہے جو گھر کا کام نوکروں پر چھوڑ کر ہوا خوری کرتی پھرتی ہے۔ تو ایک چڑیا ہے۔ تیرا کوئی حق نہیں ہے کہ بغیر میری مرضی کے باہر نکلے۔ تجھ کو میرے ساتھ اُڑنے اور ہوا خوری کرنے کا حق ہے۔ آج کل تو انڈوں کی نوکر تھی۔ تجھے یہاں سے ہٹنے کا اختیار نہ تھا۔ تو نے میرے ایک انڈے کا نقصان کر کے اتنا بڑا قصور کیا ہے کہ جس کا بدل کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو نے میرے بچے کو جان بوجھ کر مار ڈالا۔ تو نے خدا کی امانت کی قدر نہ کی جو اس نے ہم کو نسل بڑھانے کی خاطر دی تھی۔ میں تو پہلے دن منع کرتا تھا کہ اری کم بخت اس کوٹھی میں گھونسلا نہ بنا۔ ایسا نہ ہو ان لوگوں کا اثر ہم پر بھی پڑ جائے۔ ہم بچارے پرانے زمانے کے دیسی چڑے ہیں۔ خدا ہم کو نئے زمانے کے چڑے چڑیا سے بھی بچائے رکھے۔ کیوں کہ پھر گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے، مگر تو نہ مانی اور کوٹھی میں رہوں گی۔ کوٹھی میں گھر بناؤں گی۔ یہ کہہ کر میرا ناک میں دم کر دیا۔ اب لا میرا بچہ لا۔ میں تجھ سے لوں گا۔ نہیں تو مارے ٹھونگوں کے کچلا بنا دوں گا۔ بڑی صاحب نکلی تھیں ہوا کھانے۔ اب بتاؤں تجھ کو ہوا کھانے کا مزا۔ چڑیا پہلے تو اپنے غم میں چپ چاپ چڑے کی باتیں سنتی رہی۔ لیکن جب چڑا حد سے بڑھا تو اس نے زبان کھولی اور کہا:۔

"بس بس سن لیا۔ بگڑ چکے۔ زبان کو روکو۔ انڈے بچے پالنے کا مجھی پر ٹھیکہ نہیں ہے۔ تم بھی برابر کے شریک ہو۔ سویرے کے گئے یہ وقت آ گیا۔ خبر نہیں اپنی کس سگی کے ساتھ گھومتے اُڑاتے پھرتے ہوں گے۔ دوپہر میں گھر کے اندر گھسے ہیں اور آتے ہی تو مزاج دکھاتے ہیں۔ انڈا گر پڑا۔ میرے پنجے کی نوک سے۔ میں کیا کروں؟ میں کیا انڈوں کی خاطر اپنی جوان جان جی میں گھن لگا لوں؟ دو گھڑی باہر کی ہوا بھی نہ کھاؤں؟ صبح سے یہ وقت آیا ایک دانہ حلق

کے نیچے نہیں گیا۔ تم نے کھوٹے منہ سے یہ نہ پوچھا کہ تو نے کچھ کھایا۔ کچھ نگلا۔ یا مزاج ہی دکھا آتا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اکیلی چڑیا پر سب بوجھ تھا۔ اب آزادی اور برابری کا وقت ہے۔ آدھا کام تم کرو۔ آدھا میں کروں۔ دیکھتے نہیں میم صاحبہ کو وہ تو کچھ بھی کام نہیں کرتیں۔ صاحب ہی کو سارا کام کرنا پڑتا ہے اور بچے کو آیا کھلاتی ہے۔ تم نے ایک آیا رکھی ہوتی، میں تمھارے انڈے بچوں کی آیا نہیں ہوں۔"

"چڑیا کی اس تقریر سے چڑا سن ہوگیا اور کچھ جواب نہ بن پڑا۔

"بے چارہ غصے کو پی کر پھر خوشامد کرنے لگا۔ اور اس دن سے چڑیا کے ساتھ آدھی خدمت انڈے کی بانٹ کر اس نے اپنے ذمے لے لی۔

مس چڑیا کی پیدائش

"ایک انڈا تو ٹوٹ چکا تھا۔ دوسرے انڈے سے ایک بچہ نکلا جو مادہ یعنی چڑیا تھی۔ جب یہ بچہ ذرا بڑا ہوا اور اس نے میم صاحبہ کے بچے کو دیکھا کہ وہ کاٹھ کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ گھڑی گھڑی دودھ پیتا ہے۔ ٹب میں بیٹھ کر نہاتا ہے۔ نئے نئے خوب صورت کپڑے پہنتا ہے۔ تو اس چڑیازادی نے بھی باپ سے کہا۔

"چیں چیں چیں۔ ابا مجھ کو بھی گھوڑا منگا دو۔ ابا میں بھی ٹب میں نہاؤں گی۔ ابا مجھ کو بھی ایسے رنگ برنگ کے کپڑے لا کر دو۔ چڑے نے چڑیا سے کہا سے سن۔ دیکھا مزا کوٹھی میں گھر بنانے کا۔ اب لا۔ اپنی لاڈلی کے واسطے گھوڑا لا۔ ٹب منگا۔ کپڑے بنا۔

"چڑیا نے کہا۔ دیکھو پھر وہی لڑائی کی باتیں نکالیں۔ ایک کی تو تمھاری کل کل سے جان گئی۔ یہ نگوڑی بچی ہے تم اس کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ بچہ ہے کہنے دو۔ یہ کیا جانے ہم غریب ہیں اور یہ چیزیں نہیں لا سکتے۔ بڑی ہوگی تو آپ سمجھنے گی کہ چڑیوں کو آدمیوں کی ریس سے کیا سروکار۔ مس چڑیا نے ماں کی بات سن کر کہا۔ واہ بی اماں جب تم غریب تھیں۔ تم چڑیا تھیں تو اس امیر کی کوٹھی میں آکر کیوں رہی تھیں۔ گاؤں کے کسی چھپر میں گھر بنایا ہوتا۔ میں تو نہ مانوں گی اور میم صاحب کے بچے کی سی سب چیزیں منگا کر رہوں گی۔ نہ لاؤ گی تو روتی گرتی ہوں اور مرتی ہوں۔ باپ کاٹے دیتی ہوں۔ نہ زندہ رہوں گی نہ تم پر میرا بوجھ ہوگا۔

"چڑے چڑیا نے گھبرا کر کہا۔ ہے ہے۔ ایسا غضب نہ کیجیو۔ اچھا اچھا ہم سب کچھ منگا دیں گے۔ یہ کہہ کر اور مس چڑیا کو دلاسا دے کر دونوں نے چونچ سے چونچ ملائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا۔ روتے تھے اور یہ کہتے تھے۔ ہائے اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بروں کی صحبت برا کر دیتی ہے۔ یہ بیرسٹر صاحب اچھے سہی۔ مگر ان کی صحبت سے ہمارا تو ستیاناس ہو گیا۔ ہائے ہماری لاڑلی ہاتھوں سے نکل گئی۔ ہائے یہاں تو اور کوئی چڑیا بھی نہیں جو ہمارے دکھ میں شریک ہو۔ چڑے چڑیا روتے تھے اور مس چڑیا قہقہہ لگاتی تھی کہ نئے زمانے کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے۔"

اور اب آخر میں مجھے صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ حضرت خواجہ حسن نظامی کے اٹھ جانے سے اس زبان کا لکھنے والا کوئی باقی نہیں رہا جو چیلوں کے کوچے اور بیرم خاں کے تراہے میں بولی جاتی اور اپنے سحر بے نام سے بے شمار دلوں کو رام کرتی چلی جاتی تھی۔ پھر خواجہ صاحب نے تصوف کی چاشنی دے کر اس کے میٹھے بولوں کو اور بھی میٹھا کر دیا تھا اور نہ جانے کتنے سینوں میں وہ شمع روشن کر دی تھی جس کی دھیمی دھیمی روشنی میں آتما کا چین تلاش کیا جاتا اور ہستی کا مقصود پا لیا جاتا ہے۔
